پسِ حرف

عادِلؔ یزدانی

یہ درست ہے کہ مَیں اِک سِتارہ سا حرف ہوں
کروں کیا مگر مِری روشنی پسِ حرف ہے

انتساب

اپنے مرحوم والدین کے نام

گھر میں جن کی بڑی ضرورت تھی
کر گئے جانے کیوں سفر وہ لوگ

مَیں نے عادل یزدانی کی غزلیات کا مجموعہ 'پسِ حرف' پڑھا۔ مجھے تو عادل یزدانی کی غزلوں میں وہ سب کچھ نظر آیا جو ایک اچھی شاعری میں موجود ہونا چاہیئے پھر روایت سے بھی اِس کا رشتہ قائم ہے اور روایت سے اِس کی بغاوت میں بھی ایک صبحِ فردا کی روشنی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ اِس کی جدّت میں صرف خلوص ہی کی حدّت نہیں ہے معانی کی الاؤ کی آنچ بھی پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ دوسری طرف 'حال' کی تپش اور خلش بھی عادل یزدانی کی غزلوں میں اپنے ایک خاص توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی ہے یوں تو آج کل آئے دِن غزلیات کے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن مَیں سمجھتا ہوں 'پسِ حرف' جیسے مجموعے کم ہی نظر آتے ہیں۔

مشکور حسین یاد

عادلؔ یزدانی ــــ نوجدیدی رویے کا حامل شاعر

نئی نسل کے اکثر لکھنے والے اپنی ادبی تجربہ کے اظہار اور ترسیل میں ضبط اور توزن کے قائل نظر نہیں آتے۔ ایک عجیب تیز رفتاری، سیمابیت اور عجلت پسندی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ یہ اپنے کیے کا پھل فوری چاہتے ہیں۔ یہ ایک باغیانہ روش ہے، جس کے نتیجے میں طویل عرصہ پر محیط فنی ریاضت، اظہار میں تحمل اور ضبط اور خود اپنے لکھے کے احتساب کو غیر ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ دو ایک برس کی مشق سخن کے بعد اپنا مجموعہ چھاپنے میں کوئی قباحت دیکھی جاتی ہے نہ بعد ازاں مجموعے پر مجموعہ لانے میں کوئی عار سمجھی جاتی ہے۔ بظاہر اس کا سبب وہ سائنسی ثقافتی فضا ہے، جس میں نئی نسل نے آنکھ کھولی۔ اس فضا کے اہم عناصر برق رفتاری، تنوع اور تکثیریت ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہی عناصر اس فضا کے زیر اثر تشکیل پانے والے اذہان کا جزو بنے ہیں اور پھر ان کے ادبی تجربے میں بھی سرایت کر گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس نسل نے یہ رویّہ اپنے عہد کی ثقافتی فضا کی روح (Zeitgeist) کے ہوش مندانہ انجذاب کے بعد اختیار کیا ہے یا یہ محض ایک منفعل اثر پذیری کا نتیجہ ہے؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نئی نسل کے اکثر افراد اپنے زمانے سے منفعل طور پر اثر قبول کرنے والے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ شہرت یافتہ بھی ہیں۔ یہ موقع تفصیل میں جانے کا نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ ایک عہد کی روح یا میشل فوکو کی اصطلاح میں 'اے پس ٹیم' (Episteme) کے سلسلے میں دو قسم کے رویّے ہوتے ہیں: ایک انجذاب کا اور دوسرا اصارفیت کا۔ پہلا بے غرضانہ تجسس اور داخلی طلب کی پیداوار جبکہ دوسرا افادیت پسندی اور خارجی مقاصد کو اہمیت دینے کا نتیجہ ہے۔ یہ واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ تخلیقِ فن کا تعلق ان میں سے کس رویّے سے ہے۔

مَیں نے اس سوال کو سامنے رکھ کر عادلؔ یزدانی کے مسودے کا مطالعہ کیا ہے۔ عادلؔ یزدانی نئی نسل کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام رسائل میں کم کم چھپتا ہے، اس لیے یہ اتنے معروف

نہیں۔ واضح رہے کہ نہ تو شہرت کسی کے بڑے ہونے کی سند ہے نہ گمنامی کسی کے اہم ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے۔ عادل یزدانی اپنی ہم عصر نسل کی (شہرت یافتہ) اکثریت سے یکسر نہیں تو خاصے مختلف ضرور ہیں۔ فقط اس لیے نہیں کہ وہ کئی برس کی ریاضت کے بعد اپنا شعری مجموعہ لا رہے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ خود احتسابی کے قائل ہیں۔ ظاہر ہے اپنا احتساب کرنے کے لیے کوئی ضابطۂ فن اور مجموعہ اقدار درکار ہوتا ہے۔ عادل یزدانی نے جس ضابطۂ فن کو نظر میں رکھ کر اپنا احتساب و تجزیہ کیا ہے، اِسے 'نوجدیدی' (Neo Modernist) کہا جا سکتا ہے نوجدیدیت (براہ کرم اِسے مابعد جدیدیت سے گڈمڈ نہ کیا جائے) نہ روایت پر کُلی انحصار کرتی ہے نہ روایت سے انقطاع کی متحمل ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں روایت کو متحجر سمجھنے کے بجائے اسے ایک حرکی اُصول کے طور پر لیا جاتا ہے۔ جو نئے عناصر کے لیے چشم براہ رہتا ہے۔ تاہم نئے عناصر کی قبولیت روایت کے بنیادی نظام کی سالمیت سے مشروط ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو مُشکل ہے کہ عادل یزدانی نے اُردو شاعری کی روایت کے تمام سنگِ ہائے میل کا شعور حاصل کیا ہے۔ دراصل ان کا رویّہ خصوصی کی بجائے عمومی ہے اِن کے ہاں روایت کا مفہوم غزل کی فنی و جمالیاتی اقدار کا وہ نظام ہے، جسے اساتذہ نے بالعموم پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ عادل یزدانی کے ہاں اسلوبی و ہیئتی سطح پر وہ تجربہ پسندی نہیں ہے، جو شکست و ریخت کے مترادف ہے اور جسے بعض جدید غزل گوؤں نے بطورِ خاص اختیار کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عادل یزدانی کے شعری مزاج میں کچھ قدامت، اور کچھ جدّت ہے۔ ان کی جدّت کے محیط پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آیا یہ جدّت فقط اسلوب کی تازگی کے مترادف ہے یا ایک ایسا معنیاتی منطقہ بھی رکھتی ہے جو اپنے عہد کی ثقافتی فضا کی روح کو گرفت میں لینے سے جنم پذیر ہوا ہو؟ ہر چند عادل یزدانی کی شاعری میں اپنے زمانے کی فضا کے بعض اجزا سانس لیتے محسوس ہوئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی جدّت اسلوب کی تازگی کو ہی محیط ہے۔ از راہِ کرم یہاں اسلوب کے اس مفہوم کو پیشِ نگاہ رکھیے، جو فقط ڈکشن تک محدود نہیں بلکہ زاویۂ نگاہ کی انفرادیت کو بھی محتوی ہے۔ سو عادل یزدانی کے ہاں لفظ کے تخلیقی استعمال کا مُستقل رویّہ ہے۔

اور یہ رویہ دراصل اشیاء و مظاہر کو تازہ اور انوکھے زاویے سے دیکھنے سے قوت حاصل کرتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں مضامینِ تازہ کو تازہ اسلوب میں باندھا گیا ہے۔ مُشکل قوافی اور دُشوار ردیفوں کو نبھانے میں ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے جو خاصی مشق و ریاضت کے بعد ہی ہاتھ آتی ہے۔ عادلؔ یزدانی کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ کرافٹ اور آرٹ کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ فنی مہارت کو تخلیقی رعنائی سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ یہ وہ خوبی ہے جو فی زمانہ کم ہوتی چلی جارہی ہے۔

اوپر مَیں نے عادلؔ یزدانی کے شعری رویّے کو نو جدیدیت سے موسوم کیا ہے۔ نو جدیدی رویہ دراصل جدیدیت اور ترقی پسندی کی تنقید کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ جدیدیت پسندوں نے فرد اور اس کی داخلیت کو کلی حقیقت سمجھ رکھا تھا اس انتہا پسندی نے زندگی کے مادی، سماجی اور سیاسی مسائل سے صرفِ نظر کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ یہی انتہا پسندی ترقی پسندوں میں بھی موجود تھی، جو سماجی و مادی زندگی کو حتمی حقیقت سمجھنے کے التباس کا شکار تھے۔ نو جدیدی رویہ ان دونوں انتہا پسندانہ روشوں سے گریز کرتا اور اعتدال و توازن کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کی نظر میں زندگی کے ' سِگنی فائر (Signifier)' سے فردیت اور سماجیت دونوں کے ' سگنی فائیڈز (Signifieds)' منتج ہیں۔ نو جدیدیت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے عادلؔ یزدانی کی شاعری انسانی ذات کے اسرار کا انکشاف بھی ہے اور سماجی و سیاسی صورتِ حال کا بیانیہ بھی۔ وہ اندر کو نظر انداز کرتے ہیں نہ باہر کو حقیر جانتے ہیں۔ خود آگاہی اور آفاق آگاہی کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اندر اور باہر کے بیان و انکشاف میں شعر کی علامتی و رمزیاتی سطح کو قائم رکھتے ہیں۔ اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔

اپنے موقف کی تائید میں عادلؔ یزدانی کے دو چار شعر نہیں، ان کی پوری کتاب پیش ہے!

ناصر عباس نیر

۲ مئی ۲۰۰۳ء ، جھنگ

پسِ حرف ـــ چند تاثرات

ہم آج اُس عہد میں جی رہے ہیں جس میں آتش و آہن اور بارود نے ایک شہر، ایک قصبہ نہیں بلکہ بستیوں اور ملکوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ دُنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد، دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر فرعون و شداد سے بڑھ کر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے لاکھوں جوانوں بوڑھوں اور معصوم بچوں کو موت کی نیند سُلا چکا ہے پھر بھی اس کی خونی پیاس نہیں بجھتی۔ ظلم و استبداد کی یہ داستان چند سطور تک محدود نہیں کی جاسکتی۔ کہنا یہ ہے کہ ایسے عہد میں جہاں تہذیبوں، تاریخ، ثقافت اور ادب و شاعری کی تباہی کا سامان کیا جا رہا ہو، انسان اور انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، تو اِس صورتِ حال سے ایک تخلیق کار کیسے عہدہ برآ ہو۔

اِس کی دو ہی صورتیں ہیں: اِس ظلم کو برداشت کیا جائے یا پھر اس کے خلاف اُس ردِ عمل کا اظہار کیا جائے جو بڑھتے ہوئے جبر و استبداد کے خلاف ہونا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک سچا اور حقیقی تخلیق کار پہلی صورتِ حال سے کسی طور پر مفاہمت نہیں کر سکتا چنانچہ عصری ادب اور شاعری میں مزاحمت کا عمل ایک واضح شکل میں اظہار کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ عادل یزدانی کے شعری مسودے ''پسِ حرف'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مَیں نے جہاں اِس کے اشعار میں عالمی اور قومی صورتِ حال کے خلاف ردِ عمل کو محسوس کیا وہاں فطری مناظر کی جمالیاتی تشکیل و ترتیب کو بھی موجود پایا ہے۔ اور ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے بیشتر غزلوں میں قافیے سے زیادہ ردیف کو اہمیت دی ہے۔

سو کہنا مقصود یہ ہے کہ '' پسِ حرف '' میں عادل یزدانی کی شاعری صرف مزاحمتی رویّے تک محدود نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی جذبوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک یہ عمل ایک باضابطہ پسِ منظر کا حامل ہے جس کا اظہار مَیں نے اپنے متعدد تبصروں میں کیا ہے یہ پسِ منظر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جہاں تک ادب اور شاعری بالخصوص شاعری کا تعلق ہے وہ بڑے شہروں کی نسبت مضافات میں زیادہ اور بہتر انداز میں ہو رہی ہے۔

اس حقیقت سے اب انکار کی گنجائش ممکن نہیں کہ بڑے شہروں کی شاعری کو ریڈیو، ٹی وی، مشاعرے، اخبارات اور ادبی جرائد کی ضروریات نے بڑی حد تک کمرشل بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس سے شہرت و نام و نمود کی خواہش بھی پوری ہوتی ہے اور مالی منفعت کا حصول بھی ممکن ہوتا ہے جبکہ مضافات میں بسنے والے شاعر اس نوع کی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے تخلیقی عمل میں مصروف رہتے ہیں اُن کے گرد و پیش جو مظاہرِ فطرت ہیں اُن کے اظہار میں وہ جمالیاتی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو ان کے تخلیقی عمل کو رنگا رنگ حقائق سے ہم کنار کرتی ہے۔ اُن کا تخلیقی تجربہ اور مشاہدہ اسی پسِ منظر سے تشکیل پاتا ہے۔

عادل یزدانی کا تعلق بھی مضافات سے ہے اس کے شعری مسودے " پسِ حرف " کے مطالعے سے اس امر کا بجا طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ شعوری سطح پر عادل یزدانی کو ان حقائق کا مکمل ادراک ہے جن کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔ اس امر کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے اپنی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ چھوٹی بحروں میں اس کی غزلیں سہلِ ممتنع کی آئینہ دار ہیں ان میں کہیں کہیں وہ عدم سے قریب نظر آتا ہے۔

جہاں تک ردیف کا تعلق ہے ردیف کا استعمال تو ہر دور میں ہوا ہے، ہر شاعر نے کیا ہے۔ تاہم عادل یزدانی نے بیشتر غزلوں میں ردیف کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ بعض مقامات پر اس نے جس طرح محاورے کو ردیف سے ہم آمیز کیا ہے اس سے شعر میں انفرادیت کے ساتھ ایک خوش گوار کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان گذارشات کے حوالے سے مجھے اپنا مرحوم دوست ساغر صدیقی یاد آتا ہے۔ جس نے ردیف کے استعمال سے شعر کو زیادہ خوبصورت اور مستحسن انداز میں پیش کیا تھا۔

مجھے عادل یزدانی اپنے شعری مسودے میں اس انداز کا تخلیق کار لگا جو اظہار پر بھرپور قدرت رکھتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کہتا ہے۔ اس مُنافقت کے عہد میں یہ

رویّہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔ ’’ پسِ حرف ‘‘ کے بارے میں یہ بات بلا تردّد کہی جا سکتی ہے کہ یہ مجموعہ ایک تفصیلی جائزے کا مستحق تھا تاہم بوجوہ مَیں یہ چند تاثرات پیش کرتے ہوئے قطعی غیر رسمی طور پر یہ کہوں گا کہ اس کا تخلیقی تجربہ اور مشاہدہ قطعاً فطری ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تجربے اور مشاہدے کے آگے بہت آگے بڑھنے کے امکانات موجود ہیں۔

مزید یہ کہ ’’ پسِ حرف ‘‘ کے چند منتخب اشعار اس تحریر میں شامل کر کے تاثرات میں اضافہ کیا جا سکتا تھا تاہم اَمرِ مقصود یہ ہے کہ قاری اور نقاد خود اس مجموعے کا مطالعہ کریں مجھے یقین ہے کہ وہ جو نتیجہ اخذ کریں گے اُس کے مطالعے سے بہتوں کا بھلا ہوگا!

اسرار زیدی

۵۔ دھنی رام روڈ، نئی انار کلی لاہور

۷ جون ۲۰۰۳ء

چنیوٹ ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

چنیوٹ دریائے چناب کے کنارے آباد، ایک سرسبز و شاداب قدیم تاریخی شہر ہے۔
یہی وہ شہر ہے جہاں نابغۂ روزگار شخصیت ''سعداللہ خان'' مرحوم کا جنم ہوا۔ جو اپنی خُداداد صلاحتوں کی بنا پر عہدِ ''شاہجہاں'' میں ''وزیرِ اعظم'' ہندوستان کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔

انہی کے دور کی ایک یادگار تاریخی بادشاہی مسجد آج بھی شہر کے عین وسط میں عہدِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔ شُنید ہے کہ اس مسجد کے مینار سنگِ لرزاں کے ہیں۔

مسجد کے صدر دروازہ کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ بھی ہے۔ باغ اور مسجد کے صدر دروازے کے درمیان ایک چبوترہ ہے۔ جہاں شام کو مقامی شاعر، ادیب، نقاد، وکلا اور پروفیسر صاحبان رات گئے تک براجمان رہتے ہیں۔ ساتھ ہی مسجد کے زیرِ سایہ ایک ٹی سٹال ہے جہاں سے چائے منگائی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے Lahore Pak Tea House یاد آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ 'پاک ٹی ہاؤس' در و دیوار اور چھت سے آراستہ ہے جبکہ یہ کُھلے آسمان تلے واقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں اسے ہمیشہ سے Chiniot Open Tea House کا نام دیتا ہوں۔ ''گر قبول افتدز ہے عز و شرف''

مجھے آج اسی شہرِ انتخاب کے وسنیک جناب عادلؔ یزدانی پر کچھ سپردِ قرطاس کرنا ہے۔

جو شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔

عادلؔ یزدانی کا اصل نامِ نامی، اسمِ سامی ''محمد عبدالرحمٰن'' ہے۔ عادلؔ تخلص کرتے ہیں، یزدانی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اصل نام سے لوگ کم ہی واقف ہیں۔ والد مرحوم جناب ظہور احمد اظہر، بڑے صاحب علم، سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے جس کا ثبوت اُن کے اِس شعر سے ملتا ہے۔

مگر معاشی و ذاتی مسائل اور مذہبی رجحان کی وجہ سے وہ شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہ بنا سکے۔تمام عمر شعبۂ تدریس سے وابستہ رہے۔ایم۔سی پرائمری سکول محلہ کلکتی چنیوٹ سے بطور ہیڈ ماسٹر کے ریٹائر ہوئے۔علامہ اقبالؔ کے پرستاروں میں سے تھے۔علامہ صاحب کے سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔

عادلؔ یزدانی کی جنم بھومی چنیوٹ ہے۔تعلیم ایم۔اے اُردو، ایم۔اے پنجابی اور بی۔ایڈ ہے۔پیشہ کے اعتبار سے معلم ہیں۔آج کل گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول بھوانہ میں بطور سینئر سبجیکٹ سپیشلسٹ کے ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔شعبۂ تعلیم و تدریس کو اپنے والدِ مرحوم کی تاسی میں اپنایا، اپنا نام اور مقام بنایا۔

اُردو کے سکہ بند اُستاد ہیں، ادب سے گہرا لگاؤ، طبیعت میں بلا کا شعری رچاؤ ان کی اعلیٰ شعری صلاحیتوں کا غماز ہے۔اِن کا مجموعۂ کلام ' پسِ حرف ' کے نام سے کتابی شکل میں آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔

کتاب کا نام نہایت منطقی انداز کا ہے۔پہلے ہمیں اس نام کا کُلی اِدراک کرنا ہوگا۔سو یاد رہے کہ لفظ 'پس' فارسی زبان کا ہے جس کے اہلِ لغت نے معنی بعد ازاں، علاوہ، پھر اور پیچھے کے دیے ہیں۔اگر یہ لفظ کسی لفظ سے اضافتی علامت کے ساتھ آئے گا تو 'کے پیچھے' کے معنی دے گا۔چنانچہ پسِ حرف کے معنی ہوں گے حرف کے پیچھے۔شاعری کھیل ہی حرف کی جادوگری کا ہے۔حروف کی ایسی تنظیم جو کسی خاص مقصد کے لئے بحور و اوزان، قافیہ اور ردیف کے التزام کے ساتھ ہو شعر کہلاتی ہے۔مزید یہ کہ حروف کے ملنے سے الفاظ بنتے ہیں اور الفاظ انسان کے خیالات ، جذبات و احساسات اور نظریات کے اظہار کا وسیلہ بنتے ہیں۔گویا 'پسِ حرف' عادلؔ یزدانی کے دل و دماغ کی مختلف کیفیات و احساسات کا آئینہ ہے۔

شاعری محض قافیہ پیمائی اور ردیف کی بلا وجہ کھپائی کا نام نہیں، بلکہ یہ تو قافیہ آرائی، ردیف کی سجائی اور حرف و صوت کی یکجائی، اطراف و جوانبِ شعر سے آگاہی کا نام ہے۔عادلؔ

یزدانی بڑے محتاط، مشاق اور صاحبِ ادراک شاعر ہیں۔ لفظوں کے مزاج، زبان کے نشیب و فراز کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ الفاظ کی آبرو، قوافی و ردیف پر گہری نظر اور بحور کی سُوجھ بُوجھ، ہی ان کی شاعری کا نقطۂ کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف اَدق سے اَدق قوافی و ردیف اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمین میں اعلیٰ سے اعلیٰ شعری مضامین کی کاشت کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

'' پسِ حرف '' میں تشبیہات، استعارات، محاورات، محاکات اور تلمیحات کا بھرپور انداز میں آنا، اِس بات کا غماز ہے کہ وہ اردو زبان و بیاں اور حسنِ کلام کی نزاکتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

عادلؔ یزدانی بڑے گیانی اور صاحبِ ہنر شاعر ہیں۔ آیئے ان کے کلامِ بلاغت نظام پر ایک فاصلانہ، عادلانہ، منصفانہ اور طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

پسِ حرف کا انتساب عادلؔ یزدانی نے اپنے مرحوم والدین کے نام اِس شعری حوالے سے کیا ہے۔

گھر میں جن کی بڑی ضرورت تھی
کر گئے جانے کیوں سفر وہ لوگ

'پسِ حرف' کے آغاز میں حمد باری تعالیٰ، نعتِ رسولِ مقبولؐ اور سلام بحضورِ امامِ عالی مقام حضرتِ حسینؓ ملتا ہے۔

'پسِ حرف' چاہت، آرزو، محبت، خلوص، مروّت، نیازِ دل، دُعا، مدعا، شبنم، گلاب، حسنِ لازوال، نسیمِ صبح، نکہتِ گل، تازگی و شگفتگی اور روشنی کی کہکشاں ہی کہکشاں نظر آتی ہے۔

حمد باری تعالیٰ سے یہ شعر جذبۂ عشق کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔

رقص جب تک سرِ مقتل نہیں ہونے پاتا
جذبۂ عشق مکمل نہیں ہونے پاتا

نعت کے اشعار میں رسول، پھول اور اُصول وغیرہ کے قافیے کو ردیف 'جو' کے ساتھ نبھانا اِن کی قادر الکلامی اور کمالِ فن پر دلالت کرتا ہے۔ عادلؔ یزدانی کے ہاں بہت سے مقامات پر ردیف کا یہی کمال نظر آئے گا۔

الفاظ ہیں وسیلۂ مدحِ رسولؐ جو
کارِ ثواب ہو گا کہیں اُن کو پھول جو

سب اُمتوں کے واسطے ٹھہرے ہیں رہنما
بتلائے ہیں حضورؐ نے سچے اُصول جو

انہی اصولوں کی سچائی کو نواسۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؓ نے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ عادلؔ یزدانی اِن اصولوں کی سچائی کے یوں معترف ہیں۔

سَر کوفیو! نیزوں پہ ہمارے بھی سجا لو
ہم لوگ بھی ہیں حاشیہ بردارِ حُسینؓ

یہ بات اردو شعر و ادب کے قاری سے پوشیدہ نہیں کہ اُردو کی اصنافِ سخن پر فارسی کی گہری چھاپ ملتی ہے وجہ یہ ہے کہ یہ زبان برصغیر میں برس ہا برس سرکاری زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ لہٰذا اِس کا اثر اُردو میں دکھائی دینا امر لازم ہوا۔ ویسے بھی اردو میں مروجہ اصنافِ شاعری فارسی ہی سے آئی ہیں یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ اُردو زبان کا کلاسیکی شعری ادب، غزل کی بنیاد پر ہی پرکھا جاتا ہے۔ غزل کو ایک شعری ستون کا درجہ حاصل ہے۔ جب ہم اِس تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اُردو غزل کے تین ادوار نظر آتے ہیں۔

پہلا دَور: میر تقی میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، آتشؔ، جراتؔ، میر دردؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، انشاءؔ، داغؔ دہلوی، یگانہؔ چنگیزی اور اصغرؔ گونڈوی پر مشتمل ہے۔

دوسرا دَور: علامہ اقبالؔ، جوشؔ ملیح آبادی، فیضؔ احمد فیضؔ، جوشؔ ملسیانی، استاد قمرؔ جلالوی، شکیبؔ جلالی، ناصرؔ کاظمی، تسنیمؔ کیتھلوی، احمد ندیمؔ قاسمی، مشکور حسین یادؔ، کیفیؔ اعظمی، علی سردار جعفری، صہباؔ اختر، جونؔ ایلیا، ساحرؔ لدھیانوی، بشیر بدرؔ، منیرؔ نیازی، شہزاد احمد شہزادؔ، شیر افضل جعفری، امجد اسلام امجدؔ، وزیر آغاؔ، خمارؔ بارہ بنکوی، سلامؔ مچھلی شہری، اسرار زیدی، شاعرات میں پاکستان سے پروینؔ شاکر اور ہندوستان سے ممتازؔ مرزا ممتاز نظر آتی ہیں۔

تیسرا دَور: پاک و ہند کے اُن ابھرتے ہوئے غزل گو شعراء کرام کا دَور ہے جو آئندہ کے نمائندہ، قد آور، نامور اور ممتاز شعراء شمار کیے جا سکتے ہیں۔ جن میں عباس تابشؔ، اعزاز احمد آذرؔ، ناصرؔ زیدی، اسلم کولسری، گلزارؔ بخاری، نصیرؔ ترابی، سعد اللہ شاہ، فرحت عباس شاہ، سکندر سہراب مغیو، باقیؔ احمد پوری اور عادلؔ یزدانی، شاعرات میں شبنم شکیل اور یاسمین حمید وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

عادلؔ یزدانی تیسرے دَور کے شعراء میں بہت قد آور اور نامور نظر آتے ہیں۔ عادلؔ یزدانی کا اسلوبِ غزل بلا وجہ کی قافیہ پیمائی، ردیف کی کھچائی سے مبرّا ہے۔ ان کے ہاں قافیہ آرائی، ردیف اور مفاہیم و معانی کی گہرائی تہ در تہ 'پسِ حرف' میں سچائی کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اِن کی بساطِ فکر کے زاویے، ٹیڑھے اور ترچھے نہیں، بلکہ سیدھے اور سپاٹ ہیں۔ عادلؔ یزدانی کی سوچ کا دھارا جس سمت بھی سفر کرتا ہے راستے کے خس و خاشاک کو بہا لے جاتا ہے۔ عادلؔ یزدانی کے ہاں شعر برائے شعر کی روایت نہیں ملتی بلکہ ان کے ہاں تخلیقِ شعر کا عمل برائے ادب ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

یہ درست ہے کہ مَیں اِک ستارہ سا حرف ہوں
کروں کیا مگر مری روشنی پسِ حرف ہے

نہیں آسکا مرے کام اُس کا مطالعہ
وہ کھلی کتاب سا شخص ابھی پسِ حرف ہے

عادلؔ یزدانی کے جذبۂ عشقِ حقیقی کو آپ نے حمد، نعت اور سلام میں ملاحظہ فرمایا۔ اب ذرا عشقِ مجازی کا جائزہ لیجئے۔

کرتے رہے سب کچھ ہی رقم عشق سے پہلے
آسانیاں کتنی تھی بہم عشق سے پہلے

شرمندہ ہیں یہ سوچ کے اے مطلبی دُنیا
ہم تیرے تھے بے دام و دِرَم عشق سے پہلے

عادلؔ یزدانی حمد باری تعالیٰ میں ایک شعر میں یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

تُو نے بخشا وہ سلیقہ مجھے گویائی کا
کوئی مصرعہ مرا مہمل نہیں ہونے پاتا

شعری رموز سے باخبر ہونے کے باوجود بھی شاعری کو بازیچۂ اطفال نہیں سمجھتے بلکہ نہایت سُوجھ بُوجھ سے کام لیتے ہیں وادیٔ شعروسخن میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

فرازِ فکر و فن ہے اور مَیں ہوں
کہیں مَروا نہ دے بے احتیاطی

'پسِ حرف' میں جہاں چُست بندش، شعری فصاحت و بلاغت، تراکیب، کنایہ، استعارہ، روزمرّہ مرغوبِ طبیعت ردیف، کیف آور قافیہ اور خوبصورت بحور کا انتخاب کیا گیا ہے وہاں غرابتِ لفظی، ضعفِ تالیف، کلماتِ تنافر اور توالیِ اضافت نہیں ملتی۔ یہ اللہ کی خاص عطا ہے۔ محاورے کی زبان ملاحظہ ہو۔

کتنے دلکش تھے خوبصورت تھے
وہ پرندے جو ہاتھ سے نکلے

نشہ ہرن ہُوا یارب فلک نشینی کا
یہ کیسے دشت میں تُو نے اُتار ڈالا ہے

محاورہ کی ہلکی اور لطیف سی خوشبو کے جھونکے یوں آتے ہیں۔

سب گھروں کی جو خیر مانگتے ہیں
دل میں کرتے ہیں سب کے گھر وہ لوگ

کبھی جھڑتے تھے پھول اُن کے لبوں سے
کبھی وہ لوگ بھی کوئل رہے ہیں

تلمیح: ایسے الفاظ جو کسی خاص واقع کی طرف اشارہ کریں عادلؔ یزدانی کے ہاں تلمیح کی اعلیٰ مثال یوں ملتی ہے۔

جلا کے کشتیاں ماضی کی طرح پھر عادلؔ
پڑاؤ ہم نے ہی دریا کے پار ڈالا ہے

سائے سے پیار کا نتیجہ ہے
آ پڑا مجھ پہ ملبۂ دیوار

تھی زمانے کی چال بے معنی
سو ہُوا ہر سوال بے معنی

بس خیالِ صنم ، خیال افروز
اور سارے خیال بے معنی

'پسِ حرف' سے یہ غزل بھی معنی و مفہوم، فنی پختگی، منطقی سوچ اور تقاضہائے عصری کی اعلیٰ و معتبر مثال ہے۔

راہ سے رہ نورد کا رشتہ
جیسے میداں سے مرد کا رشتہ

کیوں کھٹکنے لگا ہَواؤں کو
شاخ سے برگِ زرد کا رشتہ

اب بھی قائم ہے تیری گلیوں سے
ایک آوارہ گرد کا رشتہ

سب سے پیاری ہے خُو محبت کی
سب سے اچھا ہے درد کا رشتہ

گھر سے قائم رہے سدا عادلؔ
گھر کے اک ایک فرد کا رشتہ

یہ 'پسِ حرف' کی مختصر ترین غزل ہے جو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے۔

آخر میں مَیں اِن کلمات کے ساتھ دُعاگو ہوں کہ پروردگارِ عالم چناب ادبی فورم چنیوٹ کے جنرل سیکرٹری عادلؔ یزدانی کے کلامِ بلاغت نظام کو شہرتِ عام اور بقائے دوام سے ہمکنار کرے۔ اور کتاب 'پسِ حرف' شعروادب کی دُنیا میں اعلیٰ مقام کی حامل ہو۔

(آمین ثم آمین)

دُعاگو
سید احسن عمرانی
۷۔بی گلشنِ راوی لاہور
۲۹جون ۲۰۰۳ء

شاداب موسموں کا منتظر ۔ عادلؔ یزدانی

یوں تو چناب کنارے کے خوبصورت شہر چنیوٹ کے ادبی منظر نامے میں بالخصوص شاعری میں کئی بڑے نام نظر آتے ہیں لیکن عادلؔ یزدانی کا نام اِن سب میں بالکل منفرد اور مختلف نظر آتا ہے وہ اس لئے کہ اِس کے ہاں ایک متحرک اور فعّال انسان کا تصور اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں جو زندگی پیش کرتا ہے وہ اگرچہ بہت خوبصورت ہے مگر اسے بسر کرنا بہت دُشوار ہے۔ عادلؔ یزدانی شعر کے رُوپ میں اپنے قاری کو قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ خوبصورت بندشوں اور نئی ردیفوں کی وجہ سے اُس کی غزل میں نکھار اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ تازہ لہجہ اور منفرد اسلوب ہے جو غزل کے ساتھ ساتھ عادلؔ یزدانی کو بھی بطورِ شاعر بامِ عروج پر لے آیا ہے۔ عادلؔ یزدانی اپنے گردوپیش کی بدہیئتی اور بدصورتی سے نالاں ہے اور کسی خوشگوار تبدیلی کا خواہاں ہے۔ جذبوں کی سچائی، انسان دوستی، نیاز مندی اور محبت کے فروغ کی خواہش اس کی ادبی قدآوری کی دلیل ہے۔

'پسِ حرف' اگرچہ عادلؔ یزدانی کا پہلا مجموعہ کلام ہے لیکن میری نظر میں چنیوٹ کے ادبی اُفق پر یہ نام بڑا اہم ہے۔ اپنی مٹی کے ساتھ محبت اس کی فنی سچائی کی بہترین علامت ہے۔ وہ شاعری میں نئے تجربات کو اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی مٹی کی خوشبو سے دل پذیر بناتا ہے۔ اُس نے شاداب موسموں کی منتظر آنکھوں کے ساتھ اپنے گردوپیش کو دیکھا ہے اور بھرپور اور سچا شعر کہنے میں کامیاب رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ جن موسموں کے خواب اس کی آنکھوں میں رہتے ہیں خدا اسے ان شاداب موسموں کی جلد بشارت دے تاکہ اُسے اپنی آنکھوں کی سچائی اور اپنے خوابوں کی رعنائی سے مکمل آشنائی ہو۔

جاوید اقبال زاہدؔ

صدر چناب ادبی فورم چنیوٹ

۲۱ اپریل ۲۰۰۴ء

حرفِ تشکر

'پسِ حرف' حاضر ہے۔ معدودے چند غزلوں اور نظموں کے سوا 'پسِ حرف' میں شامل سارے کلام کا دورانیہ صرف 1997ء تا 2002ء ہے۔ باوجود اس کے کہ کتاب کی ضخامت کو ممکنہ حد تک بڑھایا گیا مگر مذکورہ دورانیے کا بھی تقریباً ایک تہائی کلام شاملِ کتاب نہیں کیا جاسکا۔ سو جملہ احباب، چنیوٹ کی شعری محافل میں بھرپور داد پانے والی بہت سی غزلوں کو 'پسِ حرف' میں نہ پا کر دل گرفتہ نہ ہوں۔

شعر کہنے کا شوق میری شعر گوئی کا واحد محرّک اور مطالعہ میرا واحد اُستاد ہے۔ مَیں 'سدھارتھ' نہیں ہوں مگر شعروسخن کے دھیان، لفظ و معنی کے باہمی رشتوں کے گیان، مرکّب خیرو شرلیعنی زندگی سے جوہرِ خیر کشید کرنے کے عمل، احساس کی لگن، مَن کی اَگن، اپنی اندرونی اور بیرونی دُنیا کو سنوارنے نکھارنے اور سجانے کی طلب اور فکر و خیال کے چھتنار برگد تلے غزل و نظم کے استھان پر کی گئی تقریباً 20 سالہ ریاضت نے مجھے وہ نروان عطا کیا ہے جو مَیں 'پسِ حرف' کی صورت میں آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

'پسِ حرف' پر اپنی قیمتی آرا سے نوازنے والے ملک کے نامور نقاد جناب ناصر عبّاس نیّر اور دیگر مبصرین و شعرا جناب مشکور حسین یادؔ، جناب اسرارؔ زیدی، جناب سیّد احسنؔ عمرانی اور جناب جاوید اقبال زاہدؔ کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے میرے کلام کے بعض ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کیا جن کی بدولت 'پسِ حرف' کی قدر و منزلت میں بدرجہا اضافہ ہو گیا ہے۔

جناب سید احسن عمرانی کی محبتوں بھری تحریر اپنی جگہ مگر مجھے یقینِ کامل ہے کہ مَیں کوئی ''بڑا شاعر'' نہیں ہوں۔ ''مَیں ایک اچھا شاعر ہوں یا نہیں'' اِس اَمر کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اپنی شاعری پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ یہ آپ کا حق ہے البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ

'پسِ حرف' میں جو کچھ ہے وہ صرف اور صرف خدمتِ شعروادب کا ثمرہ ہے۔ اہلِ شہر جانتے ہیں کہ مَیں نے چنیوٹ میں شعروادب کے فروغ میں اپنے آغازِ شاعری (1984ء) سے لے کر اب تک کیا کاوشیں کی ہیں اور خطۂ چنیوٹ کی ادبی شناخت میں کتنا مثبت کردار ادا کیا ہے "یوں مدّعی حسد سے نہ دے داد، تو نہ دے" والا معاملہ الگ ہے۔

میرے اب تک کے ادبی سفر میں جن احباب نے میرا ساتھ دیا اور قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی مَیں ان سب کا ممنون و شکرگزار ہوں۔ اس میں ایوانِ شاکر چنیوٹ، بادشاہی مسجد چنیوٹ، دانش قبیلہ چنیوٹ، قلم قبیلہ چنیوٹ کی محافل میں شریک ہونے والے شعرا، نقاد، پروفیسر صاحبان اور سامعین سب شامل ہیں۔ مگر حاجی انعام الٰہی سہارن، جناب سیّد احسؔن عمرانی، جناب پروفیسر خالد شبیر احمد اور جناب پروفیسر شفقت رسول مرزا ایسے احباب ہیں جو مجھے بڑی دیر سے ملے مگر ان کی نوازشوں اور پُرخلوص محبتوں نے زندگی سے کسی گلے شکوے کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔

اپنے لائق صد آفرین شاگردوں عارفؔ خواجہ (وقت اضطراب کا)، عالمگیر نثار، خالد فرازؔ صدیقی چنیوٹی، دستگیر احمد شادؔ، علی بخت قیصرؔ، سعید مشالؔ (بہادری والا) اور اللہ دتہ شادؔ (رسول نگر) کی عقیدتوں اور شاگردانہ محبتوں کا قرض ادا کرنا میرے بس سے باہر ہے سو ان کیلئے شکریہ کا لفظ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

مشہور پنجابی شاعر، نقاد اور محقق جناب ڈاکٹر ریاض شاہدؔ، جناب صابر سودائی (جھنگ)، علی اصغر بلوچ (فیصل آباد)، نعیم بخاری (رحیم یار خاں)، شیخ ندیم عالم (ملتان) اور چوہدری وسیم احمد ایڈووکیٹ (چنیوٹ) ایسے دوست بھی میرے شعری سفر میں میرے معاون رہے۔ سو ان سب دوستوں کا بھی شکرگزار ہوں۔

'پسِ حرف' بہت تاخیر سے شائع ہو رہی ہے۔ تفصیل میں نہیں جاؤں گا مگر "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا" خوش آئند بات یہ ہے کہ یہ کتاب اُس وقت شائع ہو رہی ہے

جبکہ چنیوٹ کی ادبی فضا نہایت خوشگوار ہو چکی ہے۔ اور چنیوٹ میں ایک نئی ادبی تنظیم ''چناب ادبی فورَم چنیوٹ'' تشکیل پا چکی ہے۔ چنانچہ مَیں 'پسِ حرف' کو چناب ادبی فورَم چنیوٹ کی پہلی پیشکش قرار دیتا ہوں۔ اس حوالے سے چناب ادبی فورَم چنیوٹ کے صدر جناب جاوید اقبال زاہؔد اور دیگر تمام عہدہ داران وارا کین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سابق قلم قبیلہ چنیوٹ کی شعری محافل کے منتظم اور خادمِ شعراٗ جناب مقبول صادق عرف گڈو سہارن (صاحبزادہ ءِ حاجی انعام الٰہی سہارن) کو خراجِ تحسین پیش کرنا بھی مجھ پر لازم آتا ہے کہ اِن کی معاونت کے بغیر ان شعری محافل کا انعقاد ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

عادؔل یزدانی

جنرل سیکرٹری چناب ادبی فورَم چنیوٹ

مَیں نے عادلؔ یزدانی کی غزلیات کا مجموعہ 'پسِ حرف' پڑھا۔ مجھے تو عادلؔ یزدانی کی غزلوں میں وہ سب کچھ نظر آیا جو ایک اچھی شاعری میں موجود ہونا چاہیئے پھر روایت سے بھی اِس کا رشتہ قائم ہے اور روایت سے اِس کی بغاوت میں بھی ایک صبحِ فردا کی روشنی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ اِس کی جدّت میں صرف خلوص ہی کی حدّت نہیں ہے معانی کی الاؤ کی آنچ بھی پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ دوسری طرف 'حال' کی تپش اور خلش بھی عادلؔ یزدانی کی غزلوں میں اپنے ایک خاص توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی ہے یوں تو آج کل آئے دِن غزلیات کے مجموعے شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن مَیں سمجھتا ہوں 'پسِ حرف' جیسے مجموعے کم ہی نظر آتے ہیں۔

مشکورؔ حسین یاد

حمدِ باری تعالیٰ

رقص جب تک سرِ مقتل نہیں ہونے پاتا
جذبۂ عشق مکمل نہیں ہونے پاتا

مانتا ہوں کہ تُو شہ رگ سے ہے نزدیک مگر
تِرا دِیدار بھی ہر پَل نہیں ہونے پاتا

ہفت افلاک سے آگے کہیں مسکن ہے تِرا
پہ مِری آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا

جانے کیوں راہ میں پُر کار اٹک جاتی ہے
دائرہ کوئی مکمل نہیں ہونے پاتا

تُو نے بخشا وہ سلیقہ مجھے گویائی کا
کوئی مصرعہ مِرا مہمل نہیں ہونے پاتا

عقل والا اُسے کہنا مرا دستور نہیں
جو ترے پیار میں پاگل نہیں ہونے پاتا

شاملِ حال نہ امداد ہو تیری جب تک
مسئلہ کوئی مِرا ، حل نہیں ہونے پاتا

نعتِ رسولِ مقبولؐ

الفاظ ہیں وسیلۂ مدحِ رسولؐ جو
کارِثواب ہو گا کہیں اُن کو پھول جو

سب اُمتوں کے واسطے ٹھہرے ہیں رہنما
بتلائے ہیں حضورؐ نے سچے اُصول جو

بزمِ مہ و نجوم میں شامل نہ ہو سکے
ہونے نہ پائے آپؐ کے قدموں کی دُھول جو

لگتی نہیں ہے زیست کبھی مختصر اُنہیں
دیتے ہیں ذکرِ احمدِ مُرسلؐ کو طول جو

محروم ہی رہیں گے وہ خوشبوئے دین سے
سمجھیں گے نخلِ گُل کو ہمیشہ ببُول جو

حد ہی رہے نہ لطف و عنایات کی کوئی
کُھل جائے اِک دُعا ہی پہ بابِ قبول جو

عادِلؔ معاف کردی رسالت پناہؐ نے
مجھ سے ہوئی وفورِ عقیدت میں بھول جو

سلام

اِک بھی نہ رہے گرچہ طرفدارِ حُسینؑ
اِقرار میں بدلے گا نہ انکارِ حُسینؑ

ہر دَور میں کِھلتے رہے گلہائے صداقت
آباد اَزَل سے ہے چمن زارِ حُسینؑ

تاریخ کے اَوراق یہ دیتے ہیں گواہی
لاثانی و بے مِثل ہے کردارِ حُسینؑ

سَر شوق سے قربان کرو دِین پہ لیکن
ہر حال میں قائم رہے معیارِ حُسینؑ

ہر چند سَوا نیزے پہ ہے ظُلم کا سورج
کافی ہے ہمیں سایۂ دِیوارِ حُسینؑ

بخشیں گے بہر طور زمانے کو اُجالا
پھیلائیں گے ہر حال میں افکارِ حُسینؑ

سَر کوفیو! نیزوں پہ ہمارے بھی سجا لو
ہم لوگ بھی ہیں حاشیہ بردارِ حُسینؑ

ذی مرتبہ ہے نامِ وفا جیسے جہاں میں
اونچی ہے یونہی شانِ علمدارِ حسینؑ

ذی شان ہیں دونوں ہی وِلایت کی نظر میں
دربارِ علیؑ ہو کہ ہو دربارِ حسینؑ

معراجِ شہادت بھی ہے معراجِ نبوّت
رَہوارِ نبیؐ لگتا ہے رَہوارِ حسینؑ

یوں حُرؑ کی رِوایت کو پذیرائی ملی ہے
بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اَحرارِ حسینؑ

گو حلقۂ ماتم میں نہ اُترا کبھی عادِلؔ
لگتا ہے پہ اندر سے عزادارِ حسینؑ

ایسا لگتا تھا کہ سارے پیڑ ہی کو کھا گئی
خامشی نے پَر جو پھیلائے صدا کے پیڑ پر

جانے کس کا تیر سینے میں ترازو ہو گیا
مَیں خسارے میں رہا ہوں چھپا کے پیڑ پر

جو بہت خوش ذائقہ بھی ہوں بہت خوش رنگ بھی
وہ ثمر لگتے نہیں عادِلؔ اَنا کے پیڑ پر

تری چاہتوں کی جو روشنی پسِ حرف ہے
مری جاں خزینۂ آگہی پسِ حرف ہے

کُھلے کس طرح ترا مدّعا کسی اور پر
جو کہا گیا ہے مجھے سبھی پسِ حرف ہے

یہ دُعا سلام ، یہ عاجزی ، یہ نیازِ دل
عجب اک سلیقۂ بندگی پسِ حرف ہے

نہیں آ سکا مرے کام اُس کا مطالعہ
وہ کُھلی کتاب سا شخص ابھی پسِ حرف ہے

بڑی پیچدار لگے اُسے مری گفتگو
کہ مرے بیان کی سادگی پسِ حرف ہے

مرے پھول پھول سے حرف پر نہ ہو طعنہ زن
کہ تمام نکہت و تازگی پسِ حرف ہے

یہ درست ہے کہ مَیں اِک ستارہ سا حرف ہوں
کروں کیا مگر مِری روشنی پسِ حرف ہے

مرے حرف پر کوئی حرف آئے تو کِس لیے
مرے پارسا تِری دوستی پسِ حرف ہے

ملے عادِلؔ اُس کا نشان بھی سرِ حرف کیوں
کہ وہ میرا محورِ شاعری پسِ حرف ہے

کرتے رہے سب کچھ ہی رقم عشق سے پہلے
آسانیاں کتنی تھیں بہم عشق سے پہلے

شرمندہ ہیں یہ سوچ کے اے مطلبی دُنیا
ہم تیرے تھے بے دام و دِرَم عشق سے پہلے

بتلاتے ہیں جلّادِ زمانہ کے یہ تیور
ہوجائے گا سَر اپنا قلم عشق سے پہلے

باہَر ہوئے جاتے ہیں جو قابو سے ہمارے
طوفان وہ تھے زیرِ قدم عشق سے پہلے

ہوتے ہیں اُن آنکھوں کے اشاروں میں جو پنہاں
کُھلتے ہیں مفاہیم وہ کم عشق سے پہلے

یہ نام ، یہ پہچان تمہاری ہی عطا ہے
ہم کچھ بھی نہ تھے تیری قَسَم عشق سے پہلے

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اُس سمت کو عادِلؔ
جس سمت نہ اُٹھتے تھے قدم عشق سے پہلے

اُسے میری ضرورت پیش آئے
مگر اے دِل بہ عجلت پیش آئے

مسائل عشق کے ہم سے سمجھنا
کبھی گر تجھ کو دِقت پیش آئے

نہایت دِلنشیں تھے حادثے ، جو
سَرِ راہِ محبت پیش آئے

بڑے مشکل مراحل تھے، جو اے دِل
تِری زیرِ قیادت پیش آئے

نہ رکھتے تھے جو دِل میں نرم گوشہ
وہ ہم سے حسبِ عادت پیش آئے

ہمارے جیتے جی اُس خوش گماں کو
نہ ہو کوئی مصیبت پیش آئے

کبھی وہ تند خُو بھی ہم سے عادِل
بَصَد مِہر و محبت پیش آئے

مہمانِ دِل بنایا تھا جس سنگ زاد کو
مجروح کر گیا وہ مرے اعتماد کو

یہ کیا کہ آج بھیجے ہیں کچھ بے وفاؤں نے
پیغام تہنیت کے دِلِ زِندہ باد کو

دِن پھر گئے ہیں اُس کے ، مقدر بدل گیا
تیرا سلام پہنچا ہے جس نامُراد کو

یہ کون شہرِ خواب کو برباد کر گیا
کس کی نظر لگی ہے عُرُوس البلاد کو

کب اُس کو یہ گُماں تھا کہ ہم اپنے پاؤں سے
اِس طرح باندھ لیں گے کبھی گرد باد کو

میزانِ زر میں تُلتی نہیں ہے وفا کبھی
سمجھائے کون جا کے یہ اُس کم سواد کو

تجھ سے مِرے قیاس نے پائی ہے تقویت
تُو نے سند کیا ہے مِرے اِجتہاد کو

رکھنے لگا ہے دُنیا کی جو دُکھتی رَگ پہ ہاتھ
آواز دے رہا ہے وہ سمجھو فساد کو

ہر چند کٹ کے رہ گئی عادِلؔ زباں مِری
گالی نہ دے سکا مَیں کسی بد نہاد کو

نہ رُکے قافلہ محبت کا
ہے یہی عندیہ محبت کا

طے کرو اعتماد سے اِس کو
عُمر ہے فاصلہ محبت کا

حاصلِ عرصۂ حیات لگے
مجھ کو دَورانیہ محبت کا

کھینچ پُرکارِ ربطِ باہم سے
نت نیا دائرہ محبت کا

نفرتو! تم سے ہو نہیں سکتا
تا ابد تصفیہ محبت کا

آؤ مِل کر کریں مُرتب ہم
آج میزانیہ محبت کا

بُھول ہو کر سدا پڑا عادِلؔ
سنگ سے واسطہ محبت کا

دے گیا اپنی نشانی کوئی
اب گھڑی جائے کہانی کوئی

روک سکتا ہے تو روکے آ کر
سوچ دریا کی رَوانی کوئی

ہر خوشی تیری ہی تخلیق سہی
رنج و غم کا بھی ہے بانی کوئی

مَیں نے ڈھونڈا ہی نہیں ہے ورنہ
مِل ہی جاتا ترا ثانی کوئی

بس وہ جُملے مِرے ٹھہرے ہیں بلیغ
دے گیا جن کو معانی کوئی

دے مجھے آنکھ کے مشکیزے سے
ایک دو بُوند ہی پانی کوئی

مَیں بھی ضدّی تھا بَلا کا عادؔل
اُس نے بھی بات نہ مانی کوئی

محرومِ اِلتفات ہے وہ بے حضور ہے
جو آستانِ مہر و محبت سے دُور ہے

لگتا ہے خود کفیل و غنی ہر لحاظ سے
بخشی جسے خُدا نے متاعِ شعور ہے

لہجے کی سب حلاوتیں اپنی جگہ مگر
جو اصل مدّعا ہے وہ بین السطور ہے

کرتا نہ بھُول کر بھی چڑھائی وہ مجھ پہ یوں
حاصل اُسے کسی کی حمایت ضرور ہے

قائل نزولِ وحیِ محبت کا جو نہ تھا
اب ہاتھ میں اُسی کے وفا کی زبور ہے

ہم نے بلندیوں سے نوازا تھا کل جنہیں
اذہان میں اُنہیں کے دَر آیا فتور ہے

ہر آنکھ میں سوال دَر آئے ہیں کس لیے
کوئی نہ کوئی بات تو عادِلؔ ضرور ہے

انوکھے مہر و مہ اِسکے اُجالا مختلف ہے
پرستارانِ فکر و فن کی دُنیا مختلف ہے

کیا ہے عشق مَیں نے ہٹ کے دُنیا کی رَوِش سے
یونہی لہجہ کہاں میری غزل کا مختلف ہے

بَری مجھ کو وہ ہر تُہمت سے کرنا چاہتا تھا
مگر جو فیصلہ اُس نے سُنایا ، مختلف ہے

فقط احساس کی دولت رکھی ہے میرے گھر میں
مرا سارے زمانے سے اثاثہ مختلف ہے

منافق ہی جسے ہر گام پر ملتے رہے ہوں
اُسے ہر آدمی اندر سے لگتا مختلف ہے

زمینِ کربلا ہے اور نہ ہے باطل کا لشکر
مرے حصّے میں آیا ہے جو کوفہ ،مختلف ہے

یہ اُڑتا ہے تو اُڑتا ہی چلا جاتا ہے عادِلؔ
کہ ہر پہلو سے اُلفت کا پرندہ مختلف ہے

غموں کا گوشوارہ ہاتھ میں ہے
محبت کا نتیجہ ہاتھ میں ہے

فروزاں اُس کی مٹھی میں تھا جگنو
کہا سب نے اُجالا ہاتھ میں ہے

کروں تعمیرِ آئندہ تو کیسے
فقط خاکِ گزشتہ ہاتھ میں ہے

اِک احساسِ تہی دَستی ہے پھر بھی
اگرچہ ساری دُنیا ہاتھ میں ہے

اِدھر بھی جنگ سے بیزار ہیں سب
اُدھر بھی صلح نامہ ہاتھ میں ہے

نہ دے پایا کبھی جو امتحاں مَیں
یہ کیا اُس کا نتیجہ ہاتھ میں ہے

یہ بازی بھی رہے گی ہاتھ میرے
کہ پھر اِک ایسا پتّا ہاتھ میں ہے

کہیں پھر ہاتھ کر جائے نہ مجھ سے
پھر عادِلؔ ہاتھ جس کا ہاتھ میں ہے

اپنی مٹی سے بچھڑنے کا جواز
ڈھونڈ اب جُو سے اُکھڑنے کا جواز

تیری منزل تھی کوئی اور اگر
پھر مِرا ہاتھ پکڑنے کا جواز

اُس کے ماتھے کی فقط ایک شکن
بن گئی دِل کے اُجڑنے کا جواز

پوچھ وحشت کے نمائندوں سے
کھال یاروں کی اُدھڑنے کا جواز

کچھ تو بتلائیں بہاروں کے سفیر
شاخِ سرسبز کے جھڑنے کا جواز

پہلے جیسی ہے اگر آب و ہَوا
زخمِ دِل! تیرے بگڑنے کا جواز ؟

کاش اُس نے کبھی ڈھونڈا ہوتا
اپنی ہر بات پہ اَڑنے کا جواز

سرِ تسلیم خم سب کر چکے ہیں
جو کرنا تھا وہ ہم سب کر چکے ہیں

کسی بھی رُخ سے وہ طوفاں نہیں تھا
جسے زیرِ قدم سب کر چکے ہیں

اُصولوں کے منافی تھا سراسر
جو ازراہِ کرم سب کر چکے ہیں

وہی تاریخِ آئندہ ہے شاید
دِلوں میں جو رقم سب کر چکے ہیں

نہیں جب کوئی میرے دُکھ میں شامل
تو کیوں آنکھوں کو نم سب کر چکے ہیں

امامِ وقت کو کتنا یقیں ہے
کہ رُخ سُوئے حرم سب کر چکے ہیں

وہی تُو بھی کرے لازم نہیں ہے
جو عادِل بیش و کم سب کر چکے ہیں

ہر اِک اُصول سے کل جس نے انحراف کیا
ہمارے ظرف کا اُس نے بھی اعتراف کیا

فروغ ہم سے مِلا کاروبارِ اُلفت کو
بلند ہم نے یہاں پیار کا گراف کیا

کبھی نہ دیکھا کسی اور کی طرف ہم نے
تمام عُمر ترے گھر کا ہی طواف کیا

ترے بغیر بِتانا پڑے جو روز و شب
فراق و دَرد کے حجرے میں اعتکاف کیا

یہ کس نے کان بھرے ہیں تمام خلقت کے
یہ سارے شہر کو کس نے مِرے خلاف کیا

اُسے بھی رائے مُناسِب لگی جدائی کی
اگرچہ پہلے پہل اُس نے اختلاف کیا

شعور و فِکر کی میزان جسکے ہاتھ میں تھی
یہاں اُسی نے مِرے فن کا اعتراف کیا

اُسے ہم نے پرکھا کئی زاوِیوں سے
وہ نکلا پرایا کئی زاوِیوں سے

وہ ہر زاوِیے سے نہایت حسیں تھا
اُسے ہم نے دیکھا کئی زاوِیوں سے

ہمیں جیسے اوصاف تھے اُس میں لیکن
وہ ہم سے سوا تھا کئی زاوِیوں سے

مخالف نہیں ہیں یونہی عشق کے ہم
غلط ہے یہ پیشہ کئی زاوِیوں سے

ملوث ہے تخریبِ قلب و جگر میں
وہ معصوم چہرہ کئی زاوِیوں سے

بس اِک زاوِیے سے جھلک اُس کی دیکھی
مگر اُس پہ لکھا کئی زاوِیوں سے

مَیں کس زاوِیے سے کروں بات اُس پر
وہ عادِلؔ ہے اُلجھا کئی زاوِیوں سے

تھی زمانے کی چال بے معنی
سو ہُوا ہر سوال بے معنی

دل کو سُورج بنا لیا ہم نے
شب کا ہے اِحتمال بے معنی

آ گئے کس مُقامِ عشق پہ ہم
ہو گئی ہر مِثال بے معنی

تجھ سے رکھتی ہے ہر گھڑی مفہُوم
تیرے بِن ماہ و سال بے معنی

آ ، کہ لگنے لگی ہے اب دل کو
آرزوئے وِصال بے معنی

باہمی ربط اصلِ موسیقی
ورنہ سُر اور تال بے معنی

المیہ ہے کہ لگ رہی ہے ہمیں
جہدِ کسبِ کمال بے معنی

بس خیالِ صنم ، خیال افروز
اور سارے خیال بے معنی

رونقِ بزمِ جہاں ہیں ہم
ایک مُدّت سے یہاں ہیں ہم

کبھی ہونے کا نہ سوچا تھا جہاں
ایسا لگتا ہے وہاں ہیں ہم

تُمھی منزل ہو ہماری جاناں
تیری جانب ہی رواں ہیں ہم

خیریت پوچھنے والوں سے کہو
ہم بہت خوش ہیں ، جہاں ہیں ہم

تیسری سمت نہیں ہے کوئی
وقفِ اِیقان و گماں ہیں ہم

ہوگئے خود وہ ہَوا میں تحلیل
جو سمجھتے تھے دُھواں ہیں "ہم"

دوست تو دوست ہیں عادِلؔ ، اپنے
دشمنوں پر بھی عیاں ہیں ہم

جب سبھی کچھ تھا سایۂ دِیوار
کون پڑھتا نوشتۂ دِیوار

دیکھ انبارِ خاک و خِشت کی سمت
مجھ سے مت پوچھ قصّۂ دِیوار

فکرِ انساں کو کر گئے محدود
رشتۂ خاک و رِشتۂ دِیوار

راستہ صاف کرنے نکلے تھے
بن گئے خود جو حِصّۂ دِیوار

لگ کے دِیوار سے جو روتے ہیں
اب سنیں گے وہ گریۂ دِیوار

سائے سے پیار کا نتیجہ ہے
آ پڑا مجھ پہ ملبۂ دِیوار

تھا جو منسوبِ سرکشاں عادِلؔ
دیدنی تھا وہ سجدۂ دِیوار

اچھا تھا یا بُرا تھا مِرا نقطۂ نظر
سب سے مگر جُدا تھا مِرا نقطۂ نظر

جیسے تمام لوگ قدامت پرست تھے
سب کے لیے نیا تھا مِرا نقطۂ نظر

ہر بات میں ہے آج اُنہیں مجھ سے اختلاف
کل جن کا پیشوا تھا مِرا نقطۂ نظر

بہتان کیسے کیسے نہ مجھ پر لگے یہاں
ہر چند کہ بجا تھا مِرا نقطۂ نظر

بد نیتوں کا ساتھ دیا سارے شہر نے
حالانکہ سب پہ وَا تھا مِرا نقطۂ نظر

برحق تھے میرے سارے دلائل پہ جانے کیوں
رَد کر دیا گیا تھا مِرا نقطۂ نظر

اِک تُو ہی کیا کہ عشق و محبت کے باب میں
ہر شخص جانتا تھا مِرا نقطۂ نظر

ہر پہلُو ، ہر لحاظ سے شفّاف تھا مگر
سمجھا نہ کوئی کیا تھا مِرا نقطۂ نظر

اِس شہرِ تنگ نظراں میں عادِلؔ مِرے لیے
سب سے بڑی سزا تھا مِرا نقطۂ نظر

عشق کیا چیز ہے ، کیا شئے ہے
مرے نزدیک یہ لا شئے ہے

مَیں جسے سوچتا رہتا ہوں سَدا
وہ گمانوں سے وَرا شئے ہے

دیکھنے میں تو ہے اوروں جیسا
سوچنے میں وہ جُدا شئے ہے

چاہتا ہے جو ، بناتا ہے مجھے
مرا ماحول بھی کیا شئے ہے

مَیں جسے سب سے چھپانا چاہوں
دیکھنے کی بخدا شئے ہے

اُس کے دیکھے سے بھی تسکین ملے
وہ بڑی رُوح فزا شئے ہے

کیا بہت قیمتی ہے وہ ؟ عادِل
ہاں وہ اِک بیش بہا شئے ہے

راہ سے رہ نورد کا رِشتہ
جیسے میداں سے مَرد کا رِشتہ

کیوں کھٹکنے لگا ہَواؤں کو
شاخ سے برگِ زرد کا رِشتہ

اب بھی قائم ہے تیری گلیوں سے
ایک آوارہ گرد کا رِشتہ

سب سے پیاری ہے خُو محبت کی
سب سے اچّھا ہے درد کا رِشتہ

گھر سے قائم رہے سَدا عادِلؔ
گھر کے اِک ایک فرد کا رِشتہ

شہرِ فن کی عنایتوں سے گریز
کون کرتا ہے شہرتوں سے گریز

بے حسی کو رواج دیتا ہے
زندہ لوگوں کی صحبتوں سے گریز

لوگ تفصیلِ عشق کے طالب
اور ہم کو وضاحتوں سے گریز

زِندگی سے فرار ہے گویا
زِندگی کی حقیقتوں سے گریز

کارِ دُنیا نے کر دیا مجبور
ورنہ ہم اور دوستوں سے گریز

فرض منصور کی شریعت میں
مصلحت کی نزاکتوں سے گریز

کِن دُکھوں نے سکھا دیا عادِلؔ
تجھ کو مہتاب صورتوں سے گریز

روشنی کے حصار سے باہَر
مت نکل بزمِ یار سے باہَر

بے یقینی کے سانپ رینگتے ہیں
حلقۂ اِعتبار سے باہَر

زِندگی کر رہے ہیں وہ تقسیم
اور ہم ہیں قطار سے باہَر

آج بھی آسماں ہے کل کی طرح
کیوں مِرے اِختیار سے باہَر

اُنگلیوں پہ شُمار ہونے لگے
تھے کبھی جو شُمار سے باہَر

گرمیاں گفتگو کی پاؤ گے
چُپ کے ہر برف زار سے باہَر

تھڑ دِلے جو ہو گئے عادِلؔ
عشق کے کاروبار سے باہَر

کھلا تھا گرچہ رَستہ واپسی کا
خیال ہرگز نہ آیا واپسی کا

بڑی مشکل سے ہم نے طے کیا ہے
بڑا آساں سفر تھا واپسی کا

گیا پانی جڑوں سے کونپلوں تک
کہیں ٹھہرا نہ سوچا واپسی کا

خیال و خواب ہو کر رہ گیا ہے
وہ پیارے تیرا وعدہ واپسی کا

پرندے لوٹ آئے ہیں گھروں کو
مگر تم نے نہ سوچا واپسی کا

پلٹ آتے یقیناً ہم اگر وہ
ہمیں کرتا اِشارہ واپسی کا

سبھی کو جس کی تھی عادِلؔ توقع
وُہی نکلا نتیجہ واپسی کا

وہ کہ رہتا ہے سدا جلدی میں
جب مِلا مجھ سے مِلا جلدی میں

بڑے آرام سے سننا تھا جسے
وہ فسانہ بھی سُنا جلدی میں

مَیں بھی مصروف بہت ہوں پیارے
تُو بھی لگتا ہے بڑا جلدی میں

ہاں غلط نکلا نتیجہ اُس کا
ہم نے جو کچھ بھی کیا جلدی میں

معذِرت خواہ ہوں پیارے تجھ سے
ہو گئی مجھ سے خطا جلدی میں

بعد از مَرگ وہ آرام سے ہے
زِندگی بھر جو رہا جلدی میں

بعض لوگوں کے سَروں پہ عادِلؔ
بیٹھ جاتا ہے ہُما جلدی میں

اُسے سمجھا نہ دے بے احتیاطی
ستم یہ ڈھا نہ دے بے احتیاطی

تُو مہتابِ دیارِ دوستی ہے
تجھے گہنا نہ دے بے احتیاطی

گریزاں ہے تُو جس کے دیکھنے سے
وہ دن دِکھلا نہ دے بے احتیاطی

کسی کی لا اُبالی پن میں گزرے
کسی کو جا نہ دے بے احتیاطی

تُو خوشبوئے محبت ہے مِری جاں
تجھے بکھرا نہ دے بے احتیاطی

خلش ، رسوائیاں ، زخمِ ندامت
ہمیں کیا کیا نہ دے بے احتیاطی

فرازِ فِکر و فن ہے اور مَیں ہوں
کہیں مَروا نہ دے بے احتیاطی

یہاں جو شئے ہماری ہے
بہ شرطِ دِل تمہاری ہے

ضمانت اپنے ہونے کی
فقط خود اِنحصاری ہے

نہ چلنے دیں گے اب تیری
کہ باری اب ہماری ہے

مُرادِ آسماں شاید
زمیں کی پردہ داری ہے

دَرِ توبہ سے کچھ آگے
کرم کی راہ داری ہے

بڑی بے وزن باتیں ہیں
مگر آواز بھاری ہے

ہمہ تن گوش ہوں عادِلؔ
کہ اُس کی بات جاری ہے

جو کمیں گاہِ ذات سے نکلے
دِن کی صورت وہ رات سے نکلے

کتنے دِلکش تھے خوبصورت تھے
وہ پرندے جو ہاتھ سے نکلے

کتنے اِمکان زندہ رہنے کے
پیار کی ایک بات سے نکلے

بند ہونے لگے دفاتر کیا
آدمی کاغذات سے نکلے

تُو ہی بتلا کہ زِندگی کیسے
نرغۂ حادِثات سے نکلے

بُت شکن کتنے سَر جُھکائے ہوئے
عشق کے سومنات سے نکلے

دیکھیے آدمِ شکستہ پا
کب حدِ کائنات سے نکلے

زِیست ہے جن سے معتبر وہ لوگ
میرے نزدیک ہیں امر وہ لوگ

کچھ تعلّق نہیں مرا جن سے
مجھ سے کتنے ہیں با خبر وہ لوگ

جن کو آتا ہو زندگی کرنا
عُمر رکھتے ہیں مختصر وہ لوگ

گھر میں جن کی بڑی ضرورت تھی
کر گئے جانے کیوں سفر وہ لوگ

ہم محبت گزار لوگوں میں
دیکھیں اک دِن گزار کر وہ لوگ

سب گھروں کی جو خیر مانگتے ہیں
دِل میں کرتے ہیں سب کے گھر وہ لوگ

لاکھ سمجھایا ہم نے یزدانی
پر نہیں آئے راہ پر وہ لوگ

اِک طرف زَر کی چیرہ دَستی ہے
اِک طرف اپنی فاقہ مَستی ہے

بے ضمیری کے ہم نہیں قائل
سہل تر ورنہ کارِ ہَستی ہے

جاگ اُٹھتی ہیں وحشتیں کتنی
آنکھ جب خواب کو ترَستی ہے

اُس کا جینا بھی کوئی جینا ہے
موت آوازے جس پہ گستی ہے

مجھ خُدا مَست کی شریعت میں
خود پرستی بھی بُت پرستی ہے

اِس جہانِ ہوَس پرَستاں میں
ہر بلندی کے ساتھ پَستی ہے

آسماں جس سے تنگ ہے عادِلؔ
آدمی کی دراز دَستی ہے

خوشا کہ ہے مری تقدیر تادمِ تحریر
تمھارے پیار کی جاگیر تادمِ تحریر

تُو مجھ کو بھول چکا اور لوحِ دِل پہ مری
تمہارا نام ہے تحریر تادمِ تحریر

غمِ فراق کے بارے میں کیا لکھیں جاناں
ہے اپنا لہجہ گلوگیر تادمِ تحریر

مریضِ عشق و محبت کے واسطے جاناں
تمہاری یاد ہے اکسیر تادمِ تحریر

کسی کو موم نہ کرپایا مختصر یہ ہے
ہمارا نالۂ شب گیر تادمِ تحریر

نہیں ہے تا دَمِ تحریر کوئی بے بہرہ
کہ سب ہیں مُعتقدِ میرؔ تا دَمِ تحریر

محاذِ جنگ کا احوال پوچھنے والو
اِدھر قلم ہے اُدھر تیر تا دَمِ تحریر

اے ارضِ پاک تجھے کیوں نہیں بنایا گیا ؟
ہمارے خواب کی تعبیر تا دَمِ تحریر

سَرِ عدالتِ خُوباں ہے زیرِ بحث عادِلؔ
مری خطا مری تقصیر تا دَمِ تحریر

سُنا کے آپ ہی حُکمِ جدائی آنکھوں سے
وہ دیکھتا ہے مجھے ڈبڈبائی آنکھوں سے

رہا نہ یاد ہمیں میکدے کا رستہ بھی
بس ایک بار جو تُو نے پلائی آنکھوں سے

لبوں پہ کھیلتی دیکھی ہے ساری دُنیا کے
جو داستان بھی تُو نے سُنائی آنکھوں سے

دِکھایا تُو نے سَدا گُنجِ لب سے قریۂ خواب
غزل تُمھی نے سَدا گُنگُنائی آنکھوں سے

نہ ہو کہ مانگوں کسی سے مَیں قرضِ بینائی
نہ ہو کہ دیکھوں تجھے مَیں پرائی آنکھوں سے

نہ شہ میں فرق ہے کوئی نہ کچھ پیادوں میں
بساط کیسی یہ تُو نے بچھائی آنکھوں سے

بہت خراب ہیں حالاتِ شہرِ دِل اب کے
وہ کر گیا ہے عجب کار روائی آنکھوں سے

وہ خاک ، یارِ طرحدار کے دیار کی تھی
جو ہم نے چوم کے عادِلؔ لگائی آنکھوں سے

نہ ہو مہنگا پڑے کوئی نئی تشریح کرنا
جو سب نے کی محبت کی ، وہی تشریح کرنا

نکاتِ زندگی کُھلتے نہیں ہر آدمی پہ
اگرچہ سیکھ لے ہر آدمی تشریح کرنا

نہ آیا کس لیے اے اقتباسِ درد مجھ کو
کبھی آسان لفظوں میں تِری تشریح کرنا

تِری آنکھوں سے سیکھا ترجمانِ دِل نے شاید
نئے اِک زاوِیے سے پیار کی تشریح کرنا

جو ممکن ہو تو کچھ تخفیف کر دینا سزا میں
پُرانے فیصلے کی جب نئی تشریح کرنا

نہ آیا ٹھیک سے ہم خوش گمانوں ہی کو پیارے
تِری نگہِ غلط انداز کی تشریح کرنا

وہ شعرِ میؔر جیسا ہے سو اپنا کام ٹھہرا
کبھی پڑھنا اُسے عادِلؔ کبھی تشریح کرنا

زمیں سے رابطہ ہے آسماں سے رابطہ ہے
نگاہِ شوق کا سارے جہاں سے رابطہ ہے

رہے آسیب دِل میں بدگمانی کا تو کیسے
کئی دِن سے مرا اِک خوش گماں سے رابطہ ہے

ابھی روشن ہیں اِمکانات جینے کے ہمارے
ابھی دِل کا جہانِ مہ رُخاں سے رابطہ ہے

فسانے قبر کی وحشت کے مت ہم کو سُناؤ
اَزل سے اپنا اِس کچے مکاں سے رابطہ ہے

سلامت لوٹ سکتا ہے تُو دشتِ بے اَماں سے
اگر تھوڑا بہت شہرِ اَماں سے رابطہ ہے

پرانی جنگ کا نقشہ جما ہے اپنے دِل پہ
ہمارا آج بھی تیر و کماں سے رابطہ ہے

فقط اندر کی آنکھوں سے نظر آتا ہے پیارے
ترے خلوَت نشیں کا جس جہاں سے رابطہ ہے

بنانے کو بنا لوں مُعتمد اُس کو مَیں اپنا
مگر اُس کا گروہِ دُشمناں سے رابطہ ہے

خدا عادِلؔ تجھے محفوظ رکھے نظرِ بد سے
ترا ہر مہرباں ، نا مہرباں سے رابطہ ہے

کٹا ہُوا ہو مِرا تجھ سے رابطہ بالفرض
تو پیش آئے تجھے کوئی حادثہ بالفرض

طویل قید بھگتنا پڑے جدائی کی
ملے فرار کا تجھ کو نہ راستہ بالفرض

دیارِ خواب میں نوبت جب آئے قرعے پر
تمہارے نام نکل آئے رتجگا بالفرض

کبھی کھڑا ہو مِری جان تُو دوراہے پر
مگر قبول نہ ہو دِل کا فیصلہ بالفرض

قرار دادِ دِل و جاں ہو ہاتھ میں تیرے
پہ مُسترد ہو ترا ہر مُطالبہ بالفرض

تجھے قبیلۂ عُشاق پر ہو مان بہت
رکھے نہ کوئی مگر تجھ سے واسطہ بالفرض

سَرِ عدالتِ خُوباں ہو تُو کٹہرے میں
تِرے خِلاف دیا جائے فیصلہ بالفرض

معانقے کو بڑھے شوق سے تُو جس کی طرف
کرے نہ دوست وہ تجھ سے مصافحہ بالفرض

بنا ہے مرکز و محور تُو جس کا مدّت سے
اُس اِک نگہ کا بدل جائے زاویہ بالفرض

تُو زَعمِ حُسن میں ٹھکرا کے آ گیا جس کو
وہ شخص ہی نکل آئے کمال کا بالفرض

کُھلے کہ اصل حقیقت کچھ اور تھی لیکن
رہا کچھ اور ہی تجھ کو مُغالطہ بالفرض

رہے نہ صورتِ احوال تیرے قابو میں
فساد ، شہرِ اَنا میں ہو یوں بپا بالفرض

محبتوں میں جو عادِلؔ بہت ضروری ہے
نہ طے ہو تجھ سے وفا کا وہ مَرحلہ بالفرض

کُھلی کچہری میں دِل کی دُہائی دینا تھی
ہمیں کبھی یہ گھڑی بھی دکھائی دینا تھی

دیا بیان ہمارے خلاف تُو نے بھی
تمہیں تو پیارے ہماری صفائی دینا تھی

زبان کھولی تھی ہنگامۂ خموشی میں
ہماری بات اُسے کیا سُنائی دینا تھی

یہ کیا کہ رکھا اُسے اپنی ذات تک محدود
ہر اِک جریدے میں جو کارروائی دینا تھی

اگر تمہارے لئے یہ زمیں تھی ماں کی مِثال
تو اِس کے ہاتھ میں اپنی کمائی دینا تھی

اگر تُو اپنے غلط فیصلے پہ نادِم تھا
تو قیدِ ہجر سے مجھ کو رہائی دینا تھی

زمینِ دِل میں نئی فصل کاشت کیا کرتے
ابھی تو پچھلے برس کی کٹائی دینا تھی

کبھی تو لکھتے ہمارے لیے ملن کی ہوا
کوئی گھڑی تو ہمیں بھی حنائی دینا تھی

تباہ ہونا تھا عادِلؔ خود اپنے ہاتھوں سے
مگر غنیم کی ہم نے دُہائی دینا تھی

مَیں نے سمجھا جسے پتھر ، مِری دہلیز پہ تھا
کیا کہوں کل وہ ستمگر ، مِری دہلیز پہ تھا

نہ کھلے جس کے لبوں پر کبھی اِقرار کے پُھول
وہی اِنکار کا خوگر ، مِری دہلیز پہ تھا

مِری تقدیر میں لکھے گئے بے سمت سفر
اور مِری سوچ کا محور ، مِری دہلیز پہ تھا

دَر و دِیوار چمکتے تھے یونہی کب میرے
کوئی مہتاب سا پیکر ، مِری دہلیز پہ تھا

سازشیں اور کسی گھر میں بُنی جاتی تھیں
اور سرکار کا مُخبر ، مِری دہلیز پہ تھا

نیا فرمان لیے میری جلاوطنی کا
آج پھر میرا مقدّر ، مری دہلیز پہ تھا

وَا ہُوئے تھے نہ مرے ہونٹ ابھی پوری طرح
اور بُہتانوں کا لشکر ، مری دہلیز پہ تھا

مجھ تہی دَست سے رکھے ہوئے خیرات کی آس
سائلِ وقت برابر ، مری دہلیز پہ تھا

کیوں نہ پہچانتا دستک کا مَیں عادِلؔ انداز
مرا ساجن ، مرا دلبر ، مری دہلیز پہ تھا

گرچہ نہیں ہیں میرے ستارے مِرے خِلاف
حالات کے ہیں سارے اِشارے مِرے خِلاف

گر فتح یاب رہنے کے سِکھلائے تھے جنہیں
صف بند ہو گئے ہیں وہ سارے مِرے خِلاف

آخر کو میرے حق میں ہی جائیں گے دیکھنا
جتنے بیان بھی ہیں تمہارے مِرے خِلاف

میدان میری مرضی کا بس کر لے منتخب
لشکر وہ چاہے جتنے اُتارے مِرے خِلاف

اِک ایک کر کے ہونے لگے ہیں مِرے حلیف
کل تک رہے جو سارے کے سارے مِرے خِلاف

میں خیر خواہ اپنا اُسے کیسے مان لوں
جو میرے ساتھیوں کو اُبھارے مِرے خِلاف

مُنصِف مِزاج ہوتا جو عادِلؔ مِرا عدو
جاتے نہ اُس کے فیصلے سارے مِرے خِلاف

ساری خدائی دُور ، خدا ہے قریب تر
یہ کون میرے دِل کے ہُوا ہے قریب تر

یوں آج یاد آیا وہ دہکا ہوا بدن
جیسے شہاب کوئی گِرا ہے قریب تر

لازم نہیں وہ پیار کا مُجرِم ہو دوستو
جو سرحدِ جنوں کے مِلا ہے قریب تر

پہلو میں یوں مہکتا ہے وہ پیکرِ جمیل
جیسے گُلاب کوئی دَھرا ہے قریب تر

کُندن ہُوا وجود اُسی خوش جمال کا
جو آتشِ نظر کے رہا ہے قریب تر

آتی ہیں یوں صدائیں دیارِ خیال سے
میلہ سا جیسے کوئی لگا ہے قریب تر

کرتا نہیں ہے دُور سے بھی جو سلام اَب
وہ شخص میرے دِل کے رہا ہے قریب تر

محفوظ اپنے دِل میں ہیں اُس کے نقوش بھی
جو خال و خد میں تجھ سے لگا ہے قریب تر

اپنی سلامتی کا ہو ڈر کس لیے مجھے
ہر لمحہ مجھ سے ماں کی دُعا ہے قریب تر

یوں چاروں سمت آبی پرندوں کے غول ہیں
جیسے کوئی جزیرہ نُما ہے قریب تر

رہنے لگی ہے اپنی طبیعت بحال اب
عادِلؔ شمالِ غم کی ہَوا ہے قریب تر

نہیں کس لیے ترے پاس ہم
اِسی بات پر ہیں اُداس ہم

تُو کبھی ہمیں نہ پہن سکا
کہ نہ تھے تمہارا لباس ہم

نہیں تُو کسی کا ہمارے بِن
کریں کس طرح یہ قیاس ہم

تُو مثالِ دریا جو آ گیا
نہ چُھپا سکیں گے یہ پیاس ہم

ترا واسطہ نہیں عِشق سے
تجھے آ سکیں گے نہ راس ہم

تُو ہماری زِیست کی ہے بِنا
تری زِندگی کی اَساس ہم

رہی عُمر بھر یہی آرزُو
ہوں تری نگاہ میں 'خاص' ہم

ذرا کم ہو جو غم بے حاصلی کا
تو ہو قصہ رقم بے حاصلی کا

تھکن اَجرِ مُشقت بن گئی ہے
بڑا ہے یہ کرم بے حاصلی کا

لکھا کس نے مُقدّر میں ہمارے
کہ رونا روئیں ہم بے حاصلی کا

وہ دھرتی بے نمو ٹھہری ہمیشہ
پڑا جس پہ قدَم بے حاصلی کا

یہ کیا سب کو غزالِ عہدِ حاضر
ملا ہے تجھ سے رَم بے حاصلی کا

مٹے گا تیرے ملنے سے ہی پیارے
یہ دُکھ تیری قسَم بے حاصلی کا

ہمارے نام ہی وہ جام کیوں ہے
گھلا ہے جس میں سَم بے حاصلی کا

باقی نہیں تمیز کوئی خوب و زِشت میں
سب کچھ لکھا ہوا ہے مِری خود نوشت میں

مجھ سے نہ چُھپ سکے گا تُو اب ساری زندگی
تجھ کو سمجھ گیا ہوں مَیں پہلی نشست میں

معلوم ہی پہ کرتے نہیں اِکتفا سدا
شامِل ہے جُستجُو بھی ہماری سرِشت میں

آیا وہ مجھ کو نرغۂ غم سے نکالنے
تقسیم ہو چکا تھا مَیں جب سنگ و خِشت میں

اوجھل ہے میری آنکھ سے وہ آنکھ آج بھی
خامی سُنا ہے کوئی نہیں جس کی شِست میں

عادِلؔ تمام لذّتیں موجود ہیں مگر
اِک لذّتِ گُناہ نہیں ہے بہشت میں

کارِ حیات جب سے بنی ہے تری تلاش
اے شہرِ خواب مجھ کو بڑی ہے تری تلاش

گم کائناتِ لفظ و معانی میں اب بھی ہم
کارِ سخن وہی ہے ، وہی ہے تری تلاش

یہ اور بات گھر سے نکلنا محال ہے
اے دوست ورنہ مجھ کو بڑی ہے تری تلاش

کہتی ہیں کیا لکیریں بتا تیرے ہاتھ کی
میرے نصیب میں تو لکھی ہے تری تلاش

ممکن نہیں ہے تیری طلب سے فرار بھی
زنجیرِ زندگی کی کڑی ہے تری تلاش

لکھی ہیں یوں نصیب میں پیہم مُسافتیں
خود اپنی جُستجُو ہے کبھی ہے تری تلاش

کیا کیا دِیے نہ چاند ستاروں نے مشورے
ہم نے نئے سِرے سے جو کی ہے تری تلاش

روشنی میں راستے ہیں ، تیرگی میں راستے
اے خوشا لکھے ہیں بختِ آدمی میں راستے

جس قدر سوچا سوالِ حدِّ حُسنِ زیست پر
اُس قدر ہم کو ملے آوارگی میں راستے

کیسے ہونٹوں پر سجاتے منزلوں کی بات ہم
ہر قدم پر جب ملے تھے زندگی میں راستے

بند لگتی ہے گلی جو عاقلانِ شہر کو
سینکڑوں پائے ہیں ہم نے اُس گلی میں راستے

چار جانب رینگتے پھرتے ہوں جب دہشت کے سانپ
کیا ملیں گے ریگزارِ دشمنی میں راستے

اے روایت کے پُجاری ، اے قدامت کے اِمام
کیا نکالے گا نئے تُو شاعری میں راستے

ہم بھی جیسے صاحبِ اَسرار عادِلؔ ہو گئے
مِل رہے ہیں اب ہمیں بھی تیرگی میں راستے

نہیں کہ تجھ کو ہی دِل سے اُتار ڈالا ہے
خود اپنے آپ کو بھی ہم نے مار ڈالا ہے

کسے خبر ہے کہ ان گنت آرزوؤں نے
ہمارے چاروں طرف کیوں حِصار ڈالا ہے

طِلسمِ عشق و جنوں بھی کیا عجب ٹھہرا
کہ ہاتھ آگ میں بے اِختیار ڈالا ہے

ہر آدمی کو خبر ہے حَسَب نَسَب کی مِرے
ہوائے دَر بدَری تُو نے مار ڈالا ہے

نشہ ہرَن ہُوا یا رَبّ فلک نشینی کا
یہ کیسے دشت میں تُو نے اُتار ڈالا ہے

نگاہ رکھنا خود اپنی سِپاہ پر بھی سَدا
صفِ عدو میں اگر اِنتشار ڈالا ہے

جلا کے کشتیاں ماضی کی طرح پھر عادِلؔ
پڑاؤ ہم نے ہی دریا کے پار ڈالا ہے

پلٹ کے دیکھا تو شمس و قمر دکھائی دِیے
پھر اِن کے بعد کہیں ہمسفر دکھائی دِیے

قدم رکھا ہے بڑے اِعتماد سے اُن پر
وہ راستے جو ہمیں پُر خطر دِکھائی دِیے

اَساس جن کی تھی اوہام پر ، گمانوں پر
ہر ایک آنکھ میں کچھ ایسے ڈر دِکھائی دِیے

کہاں گرا وہ پرندہ نہ ہو سکا معلوم
فضا میں بکھرے ہوئے جس کے پَر دِکھائی دِیے

مَیں جاگتے میں رہا دُھوپ کی پناہوں میں
تھا محوِ خواب تو جلتے شجر دِکھائی دِیے

کِیا سوال محبت کی وُسعتوں کا اگر
طویل سوچ میں گم بحر و بَر دِکھائی دِیے

یقین آنے لگا باہمی محبت پر
جب اِن مکانوں میں دو چار گھر دِکھائی دِیے

کُھلا کہ عادِلؔ اُنہیں کچھ نظر نہ آتا تھا
جو اِک نظر میں بڑے خوش نظر دِکھائی دِیے

بدلا بدلا ہوا لگتا ہے زمانے کا مزاج
خوش نہیں آیا اِسے تیرے دِوانے کا مزاج

ایک پہلو بھی نہ تجھ سے مرا اوجھل رکھا
کیا عجب نکلا ترے آئنہ خانے کا مزاج

صاف گوئی کو بتایا گیا عادت میری
اور یاروں کو مِلا ڈھول اُڑانے کا مزاج

بات جاگیرِ محبت پہ کروں کیا اُس سے
جس کو وَرثے میں مِلا بات بڑھانے کا مزاج

چاہتے تو اُسے گمراہ بھی کر سکتے تھے
ہم نے پایا ہے مگر راہ دِکھانے کا مزاج

اے قلمکارِ محبت مجھے اِتنا تو بتا
مختلف تجھ سے ہے کیوں تیرے فسانے کا مزاج

سب نے عادِلؔ غلط انداز میں گایا ہے اِسے
کوئی سمجھا نہ محبت کے ترانے کا مزاج

ہمارے دِن ہی رہے کب مُدام گردِش میں
رہا ستارۂ ہر خاص و عام گردِش میں

کبھی جو پوچھے وہ حالات کا ہمارے ، تو
اُسے بتانا کہ ہیں صبح و شام گردِش میں

یہ کس بھنور میں پڑے ہیں کہ ایسا لگتا ہے
ہے کائنات کا سارا نظام گردِش میں

زمانہ ساز ہیں ایوانِ خاص میں بیٹھے
جو باوفا ہیں کھڑے ہیں غلام گردِش میں

جسے ہے ربط تری خاص مہربانی سے
کب آئے گا وہ محبت کا جام گردِش میں

وہ آسماں ہو بَھلا مجھ پہ مہرباں کیسے
جو آچکا ہے بَصَد اِہتمام گردِش میں

مُدارِ زِیست میں عادِلؔ خود اپنے محور پر
زمیں مِثال رہے سب مُدام گردِش میں

ہر ایک بات پہ میری دھیان دیتا تھا
وہ بے نیاز کبھی مجھ پہ جان دیتا تھا

جو شخص آج نمازِ وفا کا منکر ہے
کبھی وہ مسجدِ دِل میں اذان دیتا تھا

ہر ایک بات پہ ہوتا تھا آیتوں کا گماں
وہ قول دیتا تھا جب بھی زبان دیتا تھا

عجب کسان تھا وہ خواہشوں کی نگری کا
جو بے زمین تھا پھر بھی لگان دیتا تھا

جو آج نوچتا پھرتا ہے پَر عقابوں کے
وہ بے پَروں کو سُنا ہے اُڑان دیتا تھا

مگر قبول کسی نے بھی کی نہ سالاری
وہ ہر سپاہی کو اپنا نِشان دیتا تھا

آخرِ شب تاروں کی ضیا میں شبنم اور گلاب
ملتے رہیں گے کُنجِ وفا میں شبنم اور گلاب

دِل کے مشرِق سے اُبھرے گا جذبوں کا خورشید
جل جائیں گے ایک چِتا میں شبنم اور گلاب

کیا بتلائیں ڈول رہا ہے کتنوں کا ایمان
جُھوم رہے ہیں مَست ہَوا میں شبنم اور گلاب

کتنے گُم صُم سے لگتے ہیں اور کتنے چُپ چاپ
جیسے ہوں مصروف دُعا میں شبنم اور گلاب

ششدر ساری گوپیاں ، راجہ اِندر جی حیران
بیٹھے ہیں یوں پیار سبھا میں شبنم اور گلاب

دِکھلائے گی میل ملن کی رُت جب اپنا رُوپ
کھو جائیں گے رنگِ حنا میں شبنم اور گلاب

یزدانی پھیلانے نکلے تعبیروں کی باس
خوابوں کی مخمور فضا میں شبنم اور گلاب

پیار بھرا مکتوب لکھوں گا پہلی فُرصَت میں
تجھ سے دِل کی بات کہوں گا پہلی فُرصَت میں

بس تھوڑی سی اور سلجھنے دے حالات کی ڈور
تیرے پہلُو میں بیٹھوں گا پہلی فُرصَت میں

آج بہت مصروف ہوں لیکن میرا وعدہ ہے
تجھ سے اے دِلدار مِلوں گا پہلی فُرصَت میں

لگتا ہے تُو اِک رُومانی ناول کی مانند
تیرا اِک اِک لفظ پڑھوں گا پہلی فُرصَت میں

غیر ضروری کاموں سے جس دن بھی چھوٹی جان
ایک ضروری کام کروں گا پہلی فُرصَت میں

دفتر کی ہر فائل میں ہے جن آنکھوں کا عکس
اُن آنکھوں کی بات سنوں گا پہلی فُرصَت میں

میری صبحیں شامیں جس کے نام سے ہیں منسُوب
عادِلؔ اُس کو یاد کروں گا پہلی فُرصَت میں

کوئی گر کھینچ کے لاتا نہ مجھے شعلوں تک
حدّتِ غم نہ پہنچتی مِری شریانوں تک

ٹھیک ہے نیند میں چلنے کی ہمیں عادت ہے
کون لے آیا مگر جلتے ہوئے رستوں تک

گھر سے کر کے مجھے بے دخل، جو اِتراتے ہیں
مِل سکے گا نہ بدل میرا اُنہیں برسوں تک

کِس کو معلوم تھا گویائی کے ہوتے اِک دِن
مِری آواز نہ پہنچے گی تِرے کانوں تک

سب کی سب اُنگلیاں اُٹھیں گی نجوں کی جانب
قطرۂ آب نہ پُہنچے گا اگر شاخوں تک

بس وہی مجھ کو پُر اَسرار سمجھتا ہے یہاں
ہو سکی جس کی رَسائی نہ مِرے رازوں تک

نیند کا بند اگر ٹوٹ گیا تو عادِلؔ
سیلِ اَفکار پہنچ جائے گا بے فِکروں تک

مانا کہ بظاہر وہ قد آور نہیں لگتا
کوئی بھی مگر اُس کے برابر نہیں لگتا

جس پر بھی پڑا ہے مری تنہائی کا سایا
سُنسان جزیرے میں اُسے ڈر نہیں لگتا

بازار میں اُس کی بھی کتاب آنے لگی ہے
جو پہلی نظر میں ہی سخن وَر نہیں لگتا

اِس شہر میں ہر شخص کی آنکھیں ہیں سوالی
صُورت سے مگر کوئی گداگر نہیں لگتا

آسان کبھی ہوں گے شب و روز ہمارے
ایسا تو ہمیں اپنا مُقدّر نہیں لگتا

اُس بجھتے سِتارے سے بھلا دشمنی کیسی
تیری طرح عادِلؔ جو مُنوّر نہیں لگتا

آزاد فضاؤں میں نکلاتے ہیں پرندے
اک راہ نئی تجھ کو سُجھاتے ہیں پرندے

کچھ اور بھی پیار آتا ہے گاؤں کی فضا پہ
جب گیت محبت کے سُناتے ہیں پرندے

بندھنے لگی ہر آنکھ پہ پھر حرص کی پٹی
پھر جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں پرندے

کچھ اور ہی لگتی ہیں محبت کی فضائیں
جب آنکھ کی پُتلی میں سماتے ہیں پرندے

بارُود کی بُو جب سے گُھلی آب و ہَوا میں
بستی کو مِری چھوڑتے جاتے ہیں پرندے

عادِلؔ مِرے نزدیک وہ قِسمت کا دھنی ہے
ہر صُبح جسے آ کے جگاتے ہیں پرندے

کچھ ایسے دِن ہمارے ڈھل رہے ہیں
تنی رَسّی پہ جیسے چل رہے ہیں

یہ ساری وحشتیں بتلا رہی ہیں
کبھی یہ شہر بھی جنگل رہے ہیں

ہمیں بھی مُعتبر جانو دِوانو !
کہ ہم بھی چار دِن پاگل رہے ہیں

اَنا کی بات کوئی کیا کرے گا
کہ نانِ قرض پر سب پَل رہے ہیں

مجھے خورشید اُلفت کیا مِلا ہے
بہت مجھ سے اندھیرے جَل رہے ہیں

کبھی جَھڑتے تھے پُھول اُن کے لبوں سے
کبھی وہ لوگ بھی کومل رہے ہیں

جو مفہُومِ محبت سے تھے عاری
وہی جُملے مِرے مُہمَل رہے ہیں

رہے دَر پیش جو ہم اہلِ دِل کو
مری جاں اب وہ خطرے ٹل رہے ہیں

ہمیں سے تھے خفا شاداب موسم
ہمارے ہی شجر بے پھَل رہے ہیں

بجا آنکھیں ہماری نَم نہیں تھیں
مگر اندر سے ہم جَل تھَل رہے ہیں

یہ بارِ زیست عادِلؔ کیا اُٹھایا
سدا بازو ہمارے شَل رہے ہیں

دِل پہ ہوتا ہے جو اثر اَنداز
ہو سخن کیسے وہ نظر اَنداز

لفظ و معنٰی کا اِتّصالِ حسیں
اِس پہ تیرا بلیغ تر اَنداز

دِل کے آئینے میں ہے جلوہ نُما
تُو بہر رنگ اور بہر اَنداز

مجھ پہ قبضہ جما لیا تُو نے
کیا کہوں تجھ کو میرے دَر اَنداز

جانے کیا خاص بات ہے تجھ میں
اچّھا لگتا ہے تیرا ہر اَنداز

فاصلے سارے ختم ہو جائیں
ایسا اب اختیار کر اَنداز

جنگجو تھے بَلا کے جو عادِلؔ
ہو چکے ہیں وہ اب سپَر اَنداز

بات ہو کیسے رَدّ ہَواؤں کی
مُعترِف ہے خِرد ، ہَواؤں کی

وُہی خوشبو کی اِلتجائیں ہیں
اور وُہی رَدّ و کد ہَواؤں کی

اندر اندر سُلگتے رہتے ہم
گر نہ آتی مدد ہَواؤں کی

کون پہنچا رہا ہے کیا کہیے
فوجِ غم کو رَسَد ہَواؤں کی

جانے کرتے ہیں کیوں شَجر تائید
یوں بصَد شدّ و مَد ہَواؤں کی

اہلِ دِل سے بھی ہو سکی نہ کبھی
رائے کیوں مسترد ہواؤں کی

کہہ رہی ہے خلاؤں کی وسعت
ہو گئی ختم حد ہواؤں کی

کیسے مِلتا قبولِ عام ہمیں
چاہیئے تھی سَنَد ہواؤں کی

تہمتوں کے دیار میں عادِلؔ
تھی خبر مُستَنَد ہواؤں کی

مجھ سے قامت میں بڑا بھی ہو جو سایہ میرا
کر نہ پائے گا کسی طور احاطہ میرا

بند جتنے تھے سبھی توڑ دیئے ہیں مَیں نے
روک سکتا نہیں اب کوئی بھی رَستہ میرا

اِس بلندی کا تو مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا
جِس بلندی پہ ہے اِس بار سِتارہ میرا

مَیں نے بخشے ہیں خزاؤں میں اِسے تازہ گُلاب
یونہی ممنُون نہیں ہے یہ زمانہ میرا

اپنی طاقت پہ بہت ناز ہے اعدا کو میرے
ابھی میدان میں لشکر نہیں اُترا میرا

غیر ممکن کو بنا لوں گا مَیں اِک دن ممکن
ہے یہی ایک یقیں سارا اَثاثہ میرا

میرا حق ماننا ہو گا اِسے اِک دن عادِل
زیست کب تک نہیں دے گی مجھے حِصّہ میرا

ہم اپنے اِرادوں کو بدنام نہیں کرتے
جو کام نہ کرنا ہو وہ کام نہیں کرتے

اِک شامِ جُدائی کو وہ صبح نہیں دیتے
اِک صبحِ تمنّا کی ہم شام نہیں کرتے

افسوس نہیں تجھ کو گر ترکِ تعلّق پہ
اے دوست بپا ہم بھی کُہرام نہیں کرتے

ہوتے ہیں مُسافر جو اِس راہِ محبت کے
آرام کے لمحوں میں آرام نہیں کرتے

ہاتھ آتی ہے مشکل سے یہ ناموری پیارے
یوں لوگ کبھی خود کو بے نام نہیں کرتے

لغزِش پہ جو مبنی ہو ، رُسوائی کا باعث ہو
ہر ایسی کہانی کو یوں عام نہیں کرتے

کچھ عارضی خوشیاں ہیں جو راس نہیں آتیں
عادِلؔ ہمیں افسردہ آلام نہیں کرتے

پیروی ، رہبرِ دِل کی ، مِری مجبوری ہے
یہ محبت کی رَوِش ہی مِری مجبوری ہے

یہ الگ بات کہ اِنصاف طلب ہو نہ کبھی
ورنہ ہر بات میں سچّی مِری مجبوری ہے

کتنی مجبوریاں لکھی ہیں مُقدّر میں مِرے
کیسے بتلاؤں کہ تُو بھی مِری مجبوری ہے

ہر قدم تیرے اِشارے پہ اُٹھانا ہے مجھے
تِرا منشا ، تِری مرضی مِری مجبوری ہے

طبعِ خوددار سے خالق نے نوازا ہے مجھے
لب پہ آئے گی نہ جو بھی مِری مجبوری ہے

مجھ سے دشمن کا بُرا بھی نہیں چاہا جاتا
جذبۂ خیر سگالی مِری مجبوری ہے

مِرے اَحباب ہی ناخواندہ ہیں ورنہ عادِلؔ
مِری پیشانی پہ لکھی مِری مجبوری ہے

غمِ دُنیا کا طلب گار نہیں ہونے دیا
عِشق نے مجھ کو گنہگار نہیں ہونے دیا

مَیں ہوں تاریخ کے اِک ایسے حوالے کی طرح
خود جسے وقت نے بیکار نہیں ہونے دیا

جنگ سے کون گریزاں تھا مگر دشمن نے
مجھ کو اچّھی طرح تیّار نہیں ہونے دیا

ساری بستی کو جگانا تھا اُسی نے اے ہَوا
تُو نے جس شخص کو بیدار نہیں ہونے دیا

گفتگو اِتنی تو دِلچسپ نہیں تھی اپنی
پھر بھی ہم نے اُسے بیزار نہیں ہونے دیا

اُسی ماحول کے شِکوے ہیں ترے ہونٹوں پر
خود جسے تُو نے ہَوا دار نہیں ہونے دیا

یہی کافی ہے کہ اِس عہدِ تن آسانی نے
پست عادِلؔ مرا معیار نہیں ہونے دیا

یاد آئے ہیں وہ بچھڑے ہوئے ساتھی اپنے
ہاتھ اُٹھے ہیں دُعا کے لئے جب بھی اپنے

تیری آنکھوں کے وسیلے سے سمجھتے ہیں اُنہیں
لفظ کھو بیٹھتے ہیں جب بھی معانی اپنے

گرچہ ہم یاد کیا کرتے ہیں تجھ کو ، کم کم
پھر بھی اَحباب نہیں لگتے ہیں راضی اپنے

کسی پنچھی کو گرانے کا اِرادہ ہی نہ تھا
کب یونہی سارے نِشانے گئے خالی اپنے

کیوں وہی لوگ صلیبوں پہ سجا کرتے ہیں
چھوڑ جاتے ہیں جنہیں رَہ میں حواری اپنے

جمع تفریق بھی خود ہم نے سکھائی تھی جنہیں
کیسے ہو سکتے ہیں وہ لوگ مساوی اپنے

جن کی خوشبو سے مہکتی ہیں ہماری غزلیں
سارے محبوب ہیں عادِلؔ وہ خیالی اپنے

سفر جو سب سے ہٹ کر طے کیا ہے
وہ ہم نے اپنے اندر طے کیا ہے

یہ کیا آوارۂ شہرِ جنوں کا
علاج اُس نے بھی پتھر طے کیا ہے

کسے معلوم، کب اُس پر عمل ہو
جو سب نے آج مِل کر طے کیا ہے

تمہارے گِرد ہی گرداں رہیں گے
تمہیں جب اپنا محور طے کیا ہے

تھکن سے چُور سارا دِن رکھے گا
سفر جو ہم نے شب بھر طے کیا ہے

یہ کیا ہم نے محبت کا سفر بھی
حدِ اِمکاں میں رہ کر طے کیا ہے

نہیں کرنے دیا عادِلؔ کسی نے
جو ہم نے دِل میں اکثر طے کیا ہے

کھلا تازہ غزل کے تیوروں سے
وہ مِلتا ہے اب اچّھے تیوروں سے

مزاجِ یار کا اندازہ کیجے
بدلتے موسموں کے تیوروں سے

جو ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا
سمجھ جاؤ ہمارے تیوروں سے

مَیں اندر سے بہت گھبرا رہا ہوں
مجھے دیکھو نہ ایسے تیوروں سے

سب اہلِ دِل تذبذب میں پڑے ہیں
ترے پَل پَل بدلتے تیوروں سے

نہ ہو کل کو ہو اِستقبال تیرا
تنے چہروں سے ، بگڑے تیوروں سے

یہ کیا جس سے بھی تیرا ذکر چھیڑوں
مجھے دیکھے وہ تیکھے تیوروں سے

اُسے ملنے کو مَیں جا تو رہا ہوں
ملے جانے وہ کیسے تیوروں سے

مجھے کیا کیا نہیں سمجھاتے عادِلؔ
مرے حالات اپنے تیوروں سے

کرتے رہے سَدا وہ نفی میری ذات کی
کوئی گِرہ نہ جن سے کُھلی میری ذات کی

دیکھا کہ میرا مَدِمقابل کوئی نہیں
آگے سے میرے سِیل جو ہَٹی میری ذات کی

دُنیا نے جس کو میری اَنا کا دیا ہے نام
اِک برف سی ہے مجھ پہ جمی میری ذات کی

یوں اپنی اپنی ذات میں گُم تھے تمام لوگ
پروا ذرا کسی کو نہ تھی میری ذات کی

جس کے طُفَیل ہوں گا مَیں تکمِیل آشنا
وہ گمشدہ کڑی ہو تُمھی میری ذات کی

یہ کیا کہ شہرِ دِل سے وہ مجھ کو نکال کے
محسوس کر رہا ہے کمی میری ذات کی

مِلتا ہے بے حساب محبت سے بھی وہی
گِنتا ہے خامیاں بھی وہی میری ذات کی

شاید وہ مَیں نہ ہوں گا جو آئے گا سامنے
ترتیب جب لگے گی نئی میری ذات کی

مستِ اِلٰہ رہنا مجھے کیا بنا گیا
توصیف کر رہے ہیں سبھی میری ذات کی

عادِلؔ مزاجِ اہلِ چمن ہی بدل گیا
اَنفاس میں جو خوشبو رَچی میری ذات کی

دُکھ اِس دِل کو دان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ
گویا کہ نقصان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

دِل میں پھر سے اُمیدوں کے جگنو جاگ اُٹھے
پیدا پھر اِمکان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

کوئی حسیں ہے، چاہے کہیں ہے، اَپنا ہے محبوب
اِس دِل کا مہمان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

جب بھی دِل کی گہرائی سے تجھ کو یاد کیا
ہر رَستہ آسان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

بس اِک سچ کے میرے لبوں پہ آنے کی تھی دیر
اور برپا طوفان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

تخت نشینو! ہم درویشوں پر سب روشن ہے
جاری کیا فرمان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

یہ کس شارعِ خاص پہ ہم نے رکھا آج قدم
عادِلؔ ایک زبان ہُوا ہے دِیدہ نا دِیدہ

ذہن سے اُس کو نکالا نہیں جاتا ہم سے
یعنی اب خود کو سنبھالا نہیں جاتا ہم سے

مہر و مہ بھی بنے پھرتے ہیں بہ زَعمِ خود ہم
اور اندھیروں کو اُجالا نہیں جاتا ہم سے

خود کو سہمی ہوئی ، سمٹی ہوئی ہرنی کی طرح
سامنے شیر کے ڈالا نہیں جاتا ہم سے

جستجو بھی نئے آفاق کی رہتی ہے ہمیں
گھر سے پاؤں بھی نکالا نہیں جاتا ہم سے

اِک نئی شکل کے خواہاں بھی ہیں لیکن خود کو
ترے سانچے میں بھی ڈھالا نہیں جاتا ہم سے

ساعتِ نیک کو ٹھکرانے کا خمیازہ ہے
کہ بُرے وقت کو ٹالا نہیں جاتا ہم سے

کیا کہیں خاکِ دلِ سوختہ تجھ کو کیونکر
خود فضاؤں میں اُچھالا نہیں جاتا ہم سے

جس کہانی کے کبھی مرکزی کردار تھے ہم
اب دیا اُس کا حوالہ نہیں جاتا ہم سے

آس ہم سے کوئی ہمسایہ رکھے کیا عادِلؔ
اپنی اولاد کو پالا نہیں جاتا ہم سے

محبت کی شجر کاری اِک اچھا تجربہ ہے
کہو اِس ضمن میں کیسا تمہارا تجربہ ہے

سِکھا دیتا ہے جو لمحوں میں جینے کا سلیقہ
کسی کی چاہ میں مرنا اِک ایسا تجربہ ہے

اگر اِنساں کو عِرفانِ محبت ہو ذرا بھی
بہت آسان ہے جینا یہ اپنا تجربہ ہے

نجانے گُل کِھلائے کیا اناڑی پن ہمارا
کسی سے پیار کرنے کا یہ پہلا تجربہ ہے

طریقے نِت نئے اُن کو بھی آتے ہیں سِتم کے
ہمیں بھی ظلم سہنے کا پرانا تجربہ ہے

محبت کا کوئی حتمی نتیجہ کیا نکالیں
یہاں تو مختلف ہر آدمی کا تجربہ ہے

مدار اپنا پرائی سوچ پر رکھتے نہیں ہم
ہمارا رہنما عادِلؔ ہمارا تجربہ ہے

عملِ خیر بھی جب فردِ گنہ میں آئے
کون چاہے گا کہ وہ شہ کی نِگہ میں آئے

عمر بھر تازہ ہواؤں کو ترستے دیکھے
جو بھی اے حبسِ انا تیری پنہ میں آئے

لشکرِ عزم و وفا پیشہ کے سالار تھے ہم
پھر یہ کیا سوچ کے دشمن کی سِپہ میں آئے

تُو نے اِنکار بھی اِقرار کے لہجے میں کیا
لطف کیا کیا ہمیں اب کے تری نہ میں آئے

جان سے بڑھ کے مَیں کرتا ہوں حفاظت اُس کی
مرا دشمن بھی اگر میری پنہ میں آئے

کس لئے روز کیلنڈر کی طرف دیکھیں ہم
جانے وہ کون سے دِن، کون سے مہ میں آئے

لوگ شیدائی ہیں شاداب رُتوں کے عادِل
کوئی کیا خِطّۂ بے آب و گیہ میں آئے

ہر اِک بیان سے اپنے مکر گیا ہے تُو
عجیب فیصلہ اے دوست کر گیا ہے تُو

ہر ایک پَل ہے ہمارا گرفت میں جن کی
ہماری آنکھ میں وہ خواب دَھر گیا ہے تُو

کبھی جو سوچا ہے تازہ غزل کے بارے میں
تو لفظ لفظ میں جیسے اُتر گیا ہے تُو

سِکھا دِیں کس نے یہ بے اِعتمادیاں تجھ کو
خود اپنے سائے سے بھی آج ڈر گیا ہے تُو

تُو کائناتِ یقیں سے ہو آشنا کیسے
کہ وَسوسوں کے کنوئیں میں اُتر گیا ہے تُو

اب اپنے آپ کو بھی منتشر نہ کر دینا
مجھے تو خیر پریشان کر گیا ہے تُو

مرے نصیب میں لکھی تھی کب یہ بے سمتی
مجھے ہَوا کی ہتھیلی پہ دَھر گیا ہے تُو

تری اَنا کا سَرا سَر قصور ہے عادِلؔ
جہانِ فن سے اگر بے ثمر گیا ہے تُو

ہر نئی رُت میں پَر و بال کی تبدیلی سے
خود کو بہلائے رکھا شال کی تبدیلی سے

اب فقط اِذنِ رہائی کے طلبگار ہیں ہم
مطمئن ہوں گے نہ اب جال کی تبدیلی سے

نقشۂ جنگ بدلنا نہیں ممکن پیارے
ناوک و تیغ کی اور ڈھال کی تبدیلی سے

کُھل گیا ہے ترے اندر کا تذبذب مجھ پر
شاطرِ وقت تری چال کی تبدیلی سے

بھیڑیوں سے وہ رَہ و رَسم بہت رکھتا ہے
جو بھی انسان بنے کھال کی تبدیلی سے

پگڑیاں سَر پہ سجانے سے رہے ہم قاصِر
بھائی بنتے نہیں رُومال کی تبدیلی سے

جنوری بھی ہے دسمبر کی طرح سَرد مزاج
فائدہ کچھ نہ ہُوا سال کی تبدیلی سے

تُو کہ واقف نہیں اعجازِ اَنا سے عادِلؔ
خُوش نہ ہو صُورتِ احوال کی تبدیلی سے

بُھوکی نظروں سے دیکھتی ہے مجھے
موت دِن رات سوچتی ہے مجھے

ہر قدم چُومتی ہے پاؤں مرے
یہ زمیں کتنا چاہتی ہے مجھے

روز دُنیا کو مَیں کھنگالتا ہوں
روز دُنیا کھنگالتی ہے مجھے

کیوں نہ سمجھوں مَیں دیوتا خود کو
خلقتِ شہر پُوجتی ہے مجھے

کتنی بے وزن ہے وہ دُنیا خود
جو نگاہوں میں تولتی ہے مجھے

کیا گزرتی ہے تیرے دِل پہ بتا!
زِندگی جب تُو ہارتی ہے مجھے

مَیں گنہگار جب نہیں عادِلؔ
ہر گھڑی کیوں اُدھیڑتی ہے مجھے

کرے جو وِرد پَل پَل روشنی کا
کرم اُس پر مُسلسل روشنی کا

عملداری ہے کیوں قانونِ شب کی
ہے کیوں آئیں معطّل روشنی کا

نہ ہو گی چاند تاروں سے تشفّی
مَیں طالب ہوں مکمّل روشنی کا

تو کیا ہو گا؟ اندھیرے سوچتے ہیں
اگر جادو گیا چل روشنی کا

جِسے تم ' شب کدہ ' کہتے ہو یارو
لگے مجھ کو وہ مقتل روشنی کا

ستارہ ٹوٹ کر آنکھوں میں شب کی
لگا جاتا ہے کاجل روشنی کا

کبھی تو آئے گا وہ دِن بھی عادِلؔ
کہ ہو گا مسئلہ حل روشنی کا

میرے تصورات کی تجسیم کر گیا
آسان زندگی کی وہ تفہیم کر گیا

مَیں خود کو جمع کرتا رہا مدّتوں مگر
مجھ کو نئے سِرے سے وہ تقسیم کر گیا

یہ کِس نگاہِ فیض رساں کا کمال ہے
یہ کون مجھ کو لائق تعظیم کر گیا

کیا جانے کتنی بار مَیں دُہرا چکا اُسے
جو حرفِ ہجر مجھ کو وہ تعلیم کر گیا

بکھرا ہوا تھا حد سے زیادہ مَیں جس گھڑی
اک شخص میری ذات کی تنظیم کر گیا

برتی نہ اُس نے اب کے رعایت ہمارے ساتھ
اب کے دِلِ حزیں کو وہ دو نیم کر گیا

سانچے میں شاید اُسکے مَیں اب تک نہیں ڈھلا
عادِلؔ نئی جو مجھ میں ترامیم کر گیا

ٹھہرا نہ مِرے گھر میں جو اک پَل سے زیادہ
یاد آتا ہے وہ آج مجھے کل سے زیادہ

بے کار قیافے نہ لگا اے دلِ مُضطر
واقف نہیں تُو وصل کے بادل سے زیادہ

بن بیٹھا ہے تحریکِ محبت کا وہ بانی
لگتا نہیں جو عُضوِ معطّل سے زیادہ

محروم نہ ہو جائیں وہ دونوں سے کسی دِن
ہے پیار جنہیں پیڑ سے کم پھَل سے زیادہ

ہم پیاس بجھانے کو گئے جس پہ وہ دریا
افسوس نہ تھا ظرف میں چھاگل سے زیادہ

مَیں شب کا مُسافر جو دُعا بھول چکا تھا
کام آئی ہے میرے وہی مشعل سے زیادہ

رکھتے تھے جو کچھ شہر بسانے کا سلیقہ
مانوس ہیں عادِلؔ وہی جنگل سے زیادہ

ہر اِک رستہ مِرا مسدود ٹھہرا
محبت کا سفر محدود ٹھہرا

گمان و وہم کی یہ اِنتہا ہے
کہ نا موجود بھی موجود ٹھہرا

مزاجِ حضرتِ آدم بھی کیا ہے
کبھی مٹی کبھی بارُود ٹھہرا

زمیں کا اعتبار اُٹھنے لگا ہے
فلک جب سے مثالِ دُود ٹھہرا

لٹا دوں دولتِ دِل تو مَیں لیکن
ترا ملنا اگر بے سُود ٹھہرا

گیا ہے کوچۂ اُلفت میں جو بھی
طلبگارِ عطا و جُود ٹھہرا

اُسے عادِلؔ مَیں کیسے بھول جاؤں
وہ میری منزلِ مقصود ٹھہرا

بات جو بھی بڑے کمال کی ہے
ہاں اُسی صاحبِ جمال کی ہے

رُت بدلنے لگی ہے اندر کی
یہ ہَوا بالیقیں شِمال کی ہے

مَیں نے سب کچھ بنا لیا ممکن
اب مجھے جستجو محال کی ہے

زیرِ سایۂ امن و عافیت
دوستو راہ اِعتدال کی ہے

کِن اندھیروں کا سامنا ہے مجھے
تیز تر لَو ترِے خیال کی ہے

آگئے کِس بہاؤ میں ہم لوگ
لہر ہر سمت اِشتعال کی ہے

ہے خیالِ نمازِ عشق ہمیں
اور عادِلؔ گھڑی زوال کی ہے

برپا کئے رکھتا ہے جو ہلچل مِرے اندر
مجھ سا ہی کوئی رہتا ہے پاگل مِرے اندر

یہ کیسی ہوائیں ہیں کہ یوں لگتا ہے مجھ کو
لہراتا ہے پیارے ترا آنچل مِرے اندر

پھر آنے لگی یاد تری شام سی آنکھیں
پھر دِیپ تمنّا کے گئے جَل مِرے اندر

کیا تجھ کو بتاؤں غمِ دُنیا، غمِ دِل کی
اِک تَھل مِرے باہَر ہے تو اِک تَھل مِرے اندر

جب شہرِ تمنّا میں سکُونت ہی نہیں کی
اُگ آیا ہے کیوں درد کا جنگل مِرے اندر

کب یونہی لگاتار مَیں ضَو دیتا ہوں پیارے
رہتا ہے کوئی تجھ سا مسلسل مِرے اندر

وہ پیڑ مُروّت کا مِرے دِل میں لگا ہے
عادِلؔ نہ کبھی جس کا گِرا پَھل مِرے اندر

مَیں زندہ ہوں ترے بِن کون مانے
کہ ناممکن کو ممکن کون مانے

یہ تیری تجربہ کاروں سی باتیں
تجھے اے یار کمسِن کون مانے

کُھلی آنکھوں نہ دے گر کچھ سجھائی
تو پھر دِن کو مرے دِن کون مانے

ہَوا کو رُخ بدلنے کی ہے عادت
ہَوا کو میرا ضامن کون مانے

دِل و جاں کون دے تحویلِ غم میں
بھلا ڈاکو کو خازِن کون مانے

عدوئے دِل اَزل سے ہے زمانہ
اِسے دِل کا مُعاوِن کون مانے

اگر ہے شہر سارا بے سماعت
تجھے عادِلؔ مؤذِن کون مانے

آیا ہے مہ وَشوں کے نگر سے کٹا کے پَر
ناخوش نہیں پہ دِل کا پرندہ گنوا کے پَر

تم بادشاہِ وقت ہو تم خوش نصیب ہو
پھیلے ہوئے ہیں سَر پہ تمہارے ہُما کے پَر

پایا نشانِ امن کو وحشت کے سائے میں
دیکھے لہو میں ڈوبے ہوئے فاختہ کے پَر

آؤ منائیں جشن، تمدّن کی موت کا
جنگل میں آؤ ناچیں سَروں پہ سجا کے پَر

بہتر ہے کاٹ دینا ہی ایسے درخت کا
بیٹھے نہ جس پہ کوئی پرندہ بچھا کے پَر

میرا نصیب بھی ہو وِلایت کا آسماں
یا رب لگا دے مجھ کو بھی صبر و رضا کے پَر

دیکھے گا بے پَروں کو جب عادِل فضاؤں میں
رہ جائے گا قفس میں کوئی پھڑ پھڑا کے پَر

رہا قائم حصارِ بے خیالی
کبھی ٹوٹا نہ تارِ بے خیالی

اُدھر بھی بے دھیانی کا سماں ہے
اِدھر بھی ہے بہارِ بے خیالی

وہی ویران سی آنکھیں ہیں اُسکی
وہی ہے جوئبارِ بے خیالی

خیالوں کے نگر سے بھی زیادہ
بسا دیکھا دیارِ بے خیالی

تری آنکھوں میں ڈوبے تھے کبھی وہ
پڑے ہیں جو کنارِ بے خیالی

بہت محتاط رہنا دشتِ زر میں
نہ ہو جانا شکارِ بے خیالی

خیال عادِلؔ وہ کتنے دِل نشیں تھے
رہے جو زیرِ بارِ بے خیالی

دشتِ تنہائی میں مجھ کو لاپتہ ہونے نہ دے
شاید اب یہ سانحہ وہ رُونما ہونے نہ دے

سارے رِشتے بادلوں سے منقطع کرنا پڑیں
اِس قدر پابند خود کو دُھوپ کا ہونے نہ دے

روک لے ہونٹوں پہ جی میں جو تمہارے آئی ہے
شہر میں پھر اک نیا طوفاں بپا ہونے نہ دے

اِک نئے اور اجنبی رَستے کی جانب مَت بڑھا
بادِ تنہائی مجھے بے قافلہ ہونے نہ دے

خیمۂ مِہر و وفا کی سب طنابیں ٹھیک رکھ
قیمتی سرمائے کو رزقِ ہَوا ہونے نہ دے

چاہتا ہے گر تُو آئینِ تکلّم کی بقا
سخت اور اِس کی گرفتِ ناروا ہونے نہ دے

اُس کی خوشنودی سے تیری زندگی مشروط ہے
ایک پَل کو بھی اُسے عادِلؔ خفا ہونے نہ دے

آسمانوں سے سبھی رِشتے نبھاؤں گا مَیں
اب اُڑوں گا تو بس اُڑتا چلا جاؤں گا مَیں

ساتھ دے گا نہ زمانہ ترا جس دِن پیارے
چار جانب تجھے اُس دِن نظر آؤں گا مَیں

اب کُھلی آب و ہَوا میری محافظ ٹھہری
اِتنی آسانی سے اب ہاتھ نہ آؤں گا مَیں

شاخِ اُمید پہ جو تُو نے بٹھائے تھے کبھی
تا قیامت وہ پرندے نہ اُڑاؤں گا مَیں

بے مزہ جیت بھی ہوتی ہے کوئی جیت بھلا
مرے دشمن تجھے اب لڑنا سِکھاؤں گا مَیں

دَستِ حالات میں ہوں تاش کے پتّوں کی طرح
چند لمحوں میں بکھرتا چلا جاؤں گا مَیں

دِل کی دِیوار کو اِس شہرِ جفا جُو میں فقط
تری تصویرِ خیالی سے سجاؤں گا مَیں

وقتِ عادِل کبھی لائے گا کٹہرے میں اُسے
فیصلہ اپنا کبھی اُس کو سُناؤں گا مَیں

جو کئے جاتا ہے پتھر مجھے لمحہ لمحہ
دیکھتا ہے وہی منظر مجھے لمحہ لمحہ

جانے کس دیس میں ہو گا وہ کِتابی چہرہ
اب بھی رہتا ہے جو اَزبر مجھے لمحہ لمحہ

مرے اندر کا ہی لگتا ہے وہ موسم کوئی
جس نے رکھا ہے ثمروَر مجھے لمحہ لمحہ

جس کے ہر رنگ پہ حاوی تھا ترے قُرب کا رنگ
یاد آتا ہے وہ منظر مجھے لمحہ لمحہ

کب یونہی مَیں نے تر و تازگی بانٹی ہے یہاں
کوئی رکھتا ہے مُعطّر مجھے لمحہ لمحہ

اِک نئی بات بتا کر سرِ محفل تجھ کو
دیکھنا ہیں ترے تیور مجھے لَحظہ لَحظہ

رَبط آوارہ ہَواؤں سے بڑھانے دے مجھے
تُو نے رکھنا ہے جو بے گھر مجھے لَحظہ لَحظہ

جلد بازی مِری عادت، مِری فِطرت ہے مگر
زِیست کہتی ہے بَسَر کر مجھے ، لَحظہ لَحظہ

یونہی لگتا ہوں مَیں اَعصاب زدہ کب عادِل
کھائے جاتا ہے کوئی ڈر مجھے لَحظہ لَحظہ

ہر اِک بیان سے اپنے مُکر گیا ہے تُو
عجیب فیصلہ اے دوست کر گیا ہے تُو

ہر ایک پَل ہے ہمارا گرفت میں جن کی
ہماری آنکھ میں وہ خواب دَھر گیا ہے تُو

کبھی جو سوچا ہے تازہ غزل کے بارے میں
تو لفظ لفظ میں جیسے اُتر گیا ہے تُو

سِکھا دِیں کس نے یہ بے اِعتمادیاں تجھ کو
خود اپنے سائے سے بھی آج ڈر گیا ہے تُو

تُو کائناتِ یقیں سے ہو آشنا کیسے
کہ وَسوسوں کے کنوئیں میں اُتر گیا ہے تُو

اب اپنے آپ کو بھی منتشر نہ کر دینا
مجھے تو خیر پریشان کر گیا ہے تُو

مرے نصیب میں لکھّی تھی کب یہ بے سمتی
مجھے ہَوا کی ہتھیلی پہ دَھر گیا ہے تُو

تری اَنا کا سَرا سَر قصور ہے عادِلؔ
جہانِ فن سے اگر بے ثمر گیا ہے تُو

وہم ہے تشبیہ یارو اِستعارہ خواب ہے
پر نزولِ شعر کا لمحہ ہمارا خواب ہے

نیند کی آغوش میں جا کر یہ نکتہ وَا ہُوا
تیری چشمِ سُرمگیں کا ہر اِشارہ خواب ہے

اے نجومی! عِلم تیرا جو بھی کہتا ہے بجا
مَیں سمجھتا ہوں مُقدّر کا سِتارہ خواب ہے

چاہِ تنہائی میں مجھ کو پھینکتے ہو کس لیے
میری آنکھوں پر خدا نے جو اُتارا خواب ہے

پیار کے دَورانیے کے باب میں ہم کیا کہیں
پیار کا دَورانیہ سارے کا سارا خواب ہے

اپنی آنکھوں میں ہے جو اِک عُمر سے ٹھہرا ہوا
کیا کہوں اے ہم نشیں وہ کتنا پیارا خواب ہے

بات میں ہر شخص کی رنگینیاں دَر آئیں ہیں
جب سے موضوعِ سُخن عادِلؔ ہمارا خواب ہے

کہیں سے یہ اِشارا مِل رہا ہے
ہمیں کوئی دوبارا مِل رہا ہے

بلندی سے کبھی دریا کو دیکھو
کنارے سے کنارا مِل رہا ہے

مُقدّر پر نہ آئے پیار کیونکر
مرا تجھ سے سِتارا مِل رہا ہے

نہ ہاتھ آئے گا جو اچھا لگا ہے
نہیں تھا جو گوارا مِل رہا ہے

رہے دِل پہ ترا دَستِ تسلّی
بڑا مجھ کو سہارا مِل رہا ہے

تمہارے جِسم کے ہر زاوِیے سے
نیا اِک اِستعارا مِل رہا ہے

یہ کیسی شب ہے جس میں کوئی عادِلؔ
مجھے سارے کا سارا مِل رہا ہے

پہلے آکاش سے دھرتی پہ گرائے گا مجھے
پھر وہ آکاش کی جانب ہی اُٹھائے گا مجھے

سحرِ حیرت سے نکلنے نہیں دے گا مجھ کو
رُت نیا روز تماشا وہ دکھائے گا مجھے

کیا خبر تھی کہ وہ تابوتِ سکینہ کی طرح
درد کے نیل میں اِک روز بہائے گا مجھے

جانے کھولے گا وہ کب مجھ پہ حقیقت اپنی
جانے کب دِن کے اُجالے میں وہ لائے گا مجھے

وہ پرندہ ابھی جاگا ہی نہیں ہے شاید
گیت جو صبحِ محبت کے سنائے گا مجھے

جس نے خود مجھ کو بنایا ہے زمانے کا ہدَف
کیوں وہی وقت کے تیروں سے بچائے گا مجھے

کیا بُرا وقت اُسے یاد نہیں ہے عادِلؔ
خرچ کیا یونہی وہ کرتا چلا جائے گا مجھے

سو طرح کے مسئلے تھے گو وفا کے پیڑ پر
آن بیٹھے پھر بھی ہم تیری رضا کے پیڑ پر

پھر کسی کو یاد آیا تیرا پیمانِ وفا
رو دِیا ہے پھر کوئی دو دِل بنا کے پیڑ پر

جتنے پتّے لے گئی ہے ، جتنا عُریاں کر گئی
قرض اِتنے تو نہ تھے اَندھی ہَوا کے پیڑ پر

ناگ تھا وہ میرے سارے پنچھیوں کو کھا گیا
مجھ کو پچھتانا پڑا اُس کو بسا کے پیڑ پر

سارے موسم، سب رُتیں تھیں باثمر اُس کے لئے
اِکتفا جس نے کیا ماں کی دُعا کے پیڑ پر